Regd. L. No. 7243

Phone, 8080

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1968

سچے موتی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کیلئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہکر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا بہت اچھا، ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے اگر انہیں پانی دیکر اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔ باب الفتن)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought, and his research deserves careful study. It is thought-provoking, it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

Bound - Rs. 25.00 Paper back - Rs. 16.00

(Postage extra)

Can be had from :

(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,
25-B, Gulberg II, LAHORE

(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH.
Chowk Urdu Bazar, LAHORE

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ — پاکستان — دس روپے

سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے

سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان : ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلی فون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور

جلد (۲۱) — اکتوبر ۱۹۶۸ء — نمبر (۱۰)

فہرست

(۱) لمعات — ۲

(۲) "نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر" — (محترم پرویز صاحب) — ۹

(۳) باب المراسلات — طلوعِ اسلام اور فکر و نظر — (وحی کی کنہ و ماہیت) — طلاق کے قرآنی احکام) — ۲۶

(۴) طلوعِ اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن — ۳۱

(۵) الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی — (محترم رفیع اللہ صاحب) — ۴۳

(۶) حقائق و عبر — عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے جا رہے) — (ایک اور) — خطرہ یہ ہے کہ ..... — تحقیق کا دروازہ بند ہو چکا ہے) — (کتاب و سنت کی بات نہ کرو) — (بیرونی ممالک میں تبلیغ اسلام) — ۵۷

(۷) ہماری تاریخ — (علامہ تمنا عمادی صاحب) — ۶۵

(۸) روس امریکہ کا عالمی کردار — (محترم خورشید عالم صاحب) — ۷۴

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

تو اگر بھول گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو

۱۴ر اگست ۱۹۶۸ء کو اقبال پارک (لاہور) میں 'یادگار قرارداد پاکستان' کی افتتاحی تقریب بڑی شان و شوکت سے منائی جانے والی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے طول و عرض ملک میں بسنے والے ممتاز پاکستانیوں کو دعوت نامے بھیجے جا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں ذیل کی خبر شائع ہوئی۔

> ممتاز مسلم لیگیوں، سوشل ورکروں، اور قدیم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے راہ نماؤں کے ایک وفد نے، صدر صوبائی مسلم لیگ (مغربی پاکستان) مسٹر احمد سعید کرمانی سے ملاقات کی اور ان سے مطالبہ کیا کہ جن لوگوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی انہیں اس تقریب میں شرکت کے لئے مدعو نہ کیا جائے۔
> اس وفد نے اس امر پر زور دیا کہ وہ لوگ (جو ملت کی اس وقت کی جنگ کے زمانے میں) بیرونی حکمرانوں کے آلۂ کار بنے یا جنہوں نے ہندو قوم پرستوں کا ساتھ دیا تاکہ مطالبہ پاکستان کو ضعف پہنچے، ان کے لئے (تحریک پاکستان کے) مخلص کارکنوں کی صف میں کوئی مقام نہیں ہونا چاہیئے۔ وفد نے یہ بھی کہا کہ اگر ان لوگوں کو اس تقریب میں بلانا ایسا ہی ضروری ہے، تو کم از کم اتنا تو کیا جائے کہ انہیں ایک الگ گوشے میں بٹھایا جائے تاکہ وہ ان لوگوں سے الگ شناخت کئے جا سکیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی جنگ میں شرکت سے، اس قدر مصائب و صعوبات برداشت کی تھیں۔
>
> (بحوالہ پاکستان ٹائمز - ۳۱ر جولائی ۱۹۶۸ء)

یادگار قرارداد پاکستان کی مجوزہ تقریب ملتوی ہو گئی۔ اس لئے اس مطالبہ کے نفی یا اثبات میں جواب کا وقت ہی نہ آیا۔ اس کے لئے تو وقت نہ آیا، لیکن جس اصول پر اس مطالبہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، وہ ہمارے نزدیک اس قدر اہم ہے کہ اسے محض ایک وقتی مطالبہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سوال کی یہی اہمیت ان سطور کے لکھنے کی محرک ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے کئی بار لکھ چکے ہیں، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تحریک پاکستان کی کوئی ایسی تاریخ اس وقت تک مرتب نہیں ہوئی جس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ سکے کہ ہمارا مطالبہ کیا تھا۔ اس کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ کس طرح اس مطالبہ پر، برصغیر کے مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اس خطہ ارض میں خود اسلام کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔ وہ

وقت کیسا نازک تھا۔ اُس وقت اس مطالبہ کے حق میں ایک ایک شخص کی تائید کتنی اہمیت رکھتی تھی۔ وہ جنگ کس طرح لڑی گئی۔ انگریز اور ہندو نے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کے لئے کس طرح متحدہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ اگر اس قسم کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہو جاتی تو پھر ہماری موجودہ نسل (کہ جس کے شعور نے تقسیم ہند کے بعد آنکھ کھولی ہے) کی سمجھ میں یہ بات آسکتی تھی کہ ایسے نازک وقت میں جن "مسلمانوں" نے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ جنہوں نے انگریز اور ہندو کے ساتھ مل کر اس تحریک کو ناکام بنانے کی کوششیں کیں۔ جنہوں نے اسے کافرانہ تحریک قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے الگ رہنے کی تلقین کی، وہ لوگ کس درجہ کے غدارانِ ملت اور دشمنانِ اسلام تھے۔ اُس وقت کیفیت یہ تھی کہ انگریز اپنی پوری قوت اور ہندو اپنی انتہائی سازشوں کے ساتھ میدان میں اتر آیا تھا۔ ان کے مقابلہ میں ایک بے سروسامان سی جماعت تھی جس کے پاس نہ دولت تھی نہ قوت، نہ وسائل نشرواشاعت تھے نہ ذرائع رسل ورسائل ایک فکری شمع بردار (حکیم الامت علامہ اقبالؒ) اور ایک نہتہ سپہ سالار (قائداعظم محمد علی جناحؒ) اس بے سروسامان "دستہ لشکر" کے ساتھ ان کے مدمقابل تھے۔ ان کے لئے انگریز اور ہندو سے دو دو ہاتھ کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ اس کی پوری پوری صلاحیت اور استعداد رکھتے تھے لیکن خود مسلمانوں میں سے جو مارہائے آستین آ اُٹھے انہوں نے اس قدر مشکلات پیدا کر دیں کہ ان نبرد آزمایانِ جنگ حق وباطل کا بیشتر وقت اور توانائیاں انہی کی سازشوں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوگئیں۔ یہی تھے وہ غدارانِ ملت جن کا تصور حکیم الامت کے قلب حساس کی گہرائیوں میں نشتر بن کر اترا، اور ایک آہِ سوزاں بن کر جاوید نامہ کے صفحات پر اس منظر کی شکل میں نمودار ہوا جس کا عنوان اس کے متن کا صحیح آئینہ دار ہے۔ یعنی

ارواحِ رذیلہ کہ با ملک وملت غداری کردہ ودوزخ ایشاں را قبول نکردہ۔

"دوزخ ایشاں را قبول نکردہ" — ہمارے نزدیک اس سے بدتر ان کمبختوں کے حق میں کچھ اور نہیں کہا جاسکتا — یہی تھے وہ غدار جن کے متعلق علامہ نے ایک فغانِ فلک شگاف کے ساتھ کہا تھا کہ —

ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

اور —

ناقبول و ناامید و نامراد ملتے از کارِ شاں اندر فساد

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر حضرت علامہؒ کی یہ نظم، تشریحات کے ساتھ، ہماری قوم کے نوجوانوں کو پڑھا اور سمجھا دی جائے تو انہیں اس کا احساس ہو جائے کہ ان غدارانِ ملت نے کیا کیا تھا۔

تحریکِ پاکستان کا بنیادی مطالبہ اس اصول پر استوار تھا کہ مسلمان، اپنے دین (آئیڈیالوجی) کی وجہ اشتراک کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ، ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اشتراکِ وطن کی بنا پر یہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک (متحدہ) قوم نہیں بن سکتے۔ یہ نظریۂ قومیت، دین (اسلام) میں مسلمہ اصولِ اساسی کی حیثیت رکھتا ہے اسلئے اسکا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کوئی مسلمان نام رکھانے والا، اس کی مخالفت کرے گا! لیکن آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ تأسف انگیز اور عبرت ناک نظارہ کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ اس مسلمہ اصولِ دین کی مخالفت میں "حضرات علماء کرام" کا گروہ آگے بڑھا۔ اور "قال اللہ وقال الرسول" کی ابلہ فریب تلبیس سے یہ اعلان کیا کہ کافر اور مسلمان، محض

ایک جگہ (وطن) میں بسنے کی بنا پر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ کھلے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ان کے نظریۂ قومیت کی رُو سے (معاذ اللہ معاذ اللہ) محمدؐ اور ابوجہل، ایک شہر یا ایک ملک کے باشندے ہونے کی جہت سے ایک قوم کے افراد تھے۔ یہ ننگِ دین گروہ "نیشنلسٹ علماء" کے برش زدہ نشان سے متعارف ہوا۔ اس گروہ میں جمعیت العلماء ہند، مجلسِ احرار، انصار، سرحد کے سرخ پوش (یعنی عبدالغفار خان کے خدائی خدمتگار) سب جتھے بنا بنا کر تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں صف آراء ہو رہے تھے۔ جمعیت العلماء میں (مولانا) ابوالکلام آزاد، (مولانا) حسین احمد مدنی دیوبندی، (مفتی) کفایت اللہ، (مولانا) احمد سعید، وغیرہ اس گروہ کے سرخیل تھے اور ان کے پیچھے ان کے تلامذہ اور متبعین کی فوج جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ مجلسِ احرار نے پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ سرحد سرخ پوشوں کے نرغے میں تھا۔ "علماء" میں چونکہ بجز چند ایک، سب متحدہ قومیت کے حامی تھے اس لئے ملک کی تمام مساجد، ہر محراب و منبر خلافِ تحریکِ پاکستان کی نشرگاہ تھا۔ احرار میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیسے شعلہ بیان مقرر تھے جو عوام کو مسلسل اشتعال دلاتے رہتے تھے۔ اور قائد اعظمؒ کے خلاف سوقیانہ پن تک اتر آتے تھے۔ "قائد اعظمؒ" کو "کافر اعظم" کا لقب احرار ہی کا عطا کردہ تھا۔ (مولانا) حسین احمد مدنی اقبالؒ کو انگریز کا پٹھو بتایا کرتے تھے۔ (مولانا) آزاد، قائد اعظمؒ کو تو مسلمان ہی تصور نہیں کرتے تھے لیکن مہاتما گاندھی کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ

> وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو جھکنے نہیں دیتا۔
>
> (خطبۂ صدارت ۔ پرتاب گڑھ کانگریس)

سندھ کے خان بہادر اللہ بخش، تقسیمِ ہند کی اسکیم کے متعلق کہتے تھے کہ یہ آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکانے کے لئے وضع کی گئی ہے۔ عبدالرحمٰن سرحدی کا ارشاد تھا کہ یہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے (مولانا) حبیب الرحمٰن لدھیانوی اسے مسلمانوں کے لئے انتہائی نقصان رساں قرار دیتے تھے۔ اور سرحدی گاندھی اور (مولانا) آزاد اس وقت بھی اس کی مخالفت کر رہے تھے جب ہندو اور انگریز دونوں نے تقسیمِ ہند کی اسکیم منظور کر لی تھی۔ یہ لوگ متواتر دس سال تک تحریکِ پاکستان کے خلاف جو کچھ کہتے اور لکھتے رہے اس کی تفصیل کے لئے ایک مبسوط تصنیف کی ضرورت ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جسے انہوں نے اس کی مخالفت میں استعمال نہ کیا ہو۔ اور کوئی دقیقہ ایسا نہ تھا جسے انہوں نے اس "جہادِ عظیم" کے سلسلہ میں فروگذاشت کیا ہو۔

لیکن ان تمام مخالفتوں میں سب سے زیادہ خطرناک اور نقصان رساں مخالفت امیر جماعتِ اسلامی، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تھی۔ ان صاحب کی سیاسی تدبیریں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ یہ پہلے نیشنلسٹ علماء کے گروہ میں شامل تھے اور شامل بھی اس حیثیت سے کہ یہ جمعیت العلماء کے اخبار "الجمعیۃ" (دہلی) کے ایڈیٹر تھے۔ اس حیثیت سے یہ برسوں مسلمانوں کو متحدہ قومیت کا سبق پڑھاتے رہے۔ ان کی افتادِ طبیعت "انا الموجود لا غیری" قسم کی واقع ہوئی ہے۔ یعنی یہ جہاں رہیں گے خود امیر بننے کی کوشش کریں گے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ جمعیت العلماء میں ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ جیسے جغادریوں کے سامنے ان کا چراغ نہیں جل سکتا تو

وہاں سے الگ ہو کر حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے متحدہ قومیت کی مخالفت اور مسلم لیگ میں شامل ہوئے بغیر، دو قومی نظریہ کی حمایت میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو جدھر سے دو قومی نظریہ کی حمایت میں آواز سنائی دیتی وہ اس گوشے کو احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتے تھے۔ یوں انہوں نے پاکستان پسند مسلمانوں کے حلقہ میں شہرت حاصل کر کے پنجاب کا رُخ کیا۔ یہاں ان کی اچھی خاصی آؤ بھگت ہوئی۔

دو قومی نظریہ کی رُو سے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا حصول مدِّ نظر تھا۔ لیکن اسلامی مملکت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس میں اسلامی انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ کے زعماء نے اقبالؒ کے خطبہ صدارت ۱۹۳۰ء سے لے کر آخر تک ہر مقام پر اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں اسلامی انداز کی حکومت قائم کی جائے گی۔ مودودی صاحب نے پہلے اس نکتہ پر زور دیا کہ اسلامی حکومت کے خط و خال کیا ہوتے ہیں اور اس کا قیام کس طرح عمل میں آتا ہے۔ اس طرح اپنا اعتماد قائم کرنے کے بعد، وہ اپنے اصل مقصد پر آ گئے اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا سوچئے کہ اس انداز کی اسلامی حکومت، یہ مسٹر قسم کے لوگ قائم کر سکیں گے؟ یوں انہوں نے اسلام کے نقاب میں، مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے اربابِ حل و عقد کے خلاف لوگوں کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ کبھی لکھا کہ

> افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔
>
> (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

پھر اسی لَے کو اور آگے بڑھایا اور کہا۔

> ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں تو ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔ (ایضاً)

یہ تو تحریکِ پاکستان کے کارکنان کے متعلق کہا۔ خود پاکستان کے متعلق یہ کہہ کر لوگوں کے دلوں میں شیطانی وساوس ابھارتے رہے کہ

> جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔
>
> (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

لہ اب مودودی صاحب اسی جمہوری نظام کو عین اسلام قرار دے کر اس کے قیام کی مہم کو جماعت اسلامی کا جہاد عظیم قرار دے رہے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جس مملکت کے حصول کے لئے مسلمان انگریز، ہندو اور نیشنلسٹ مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے، اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "کافرانہ حکومت" ہوگی، عوام کو اس تحریک سے برگشتہ کرنے کا کس قدر مؤثر حربہ تھا۔

مودودی صاحب، ایک دو دن نہیں، مسلسل ۱۹۴۷ء تک اس قسم کے خیالات مسلمانوں میں عام کرتے رہے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ قیادت، جناح کی بجائے میرے حوالے کیوں نہیں کی جاتی۔ دیکھئے وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کس انداز میں کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

یعنی وہ جو برسوں تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نظریہ پیش کیا جاتا رہا تھا، اسے بھی ختم کر دیا۔

یہ تھا ان حضرات کا طرزِ عمل، تحریکِ پاکستان، اور مطالبہ پاکستان کے خلاف۔ یہ تو یوں کہیئے کہ فضلِ ایزدی تھا جس نے قائداعظمؒ اور ان کے ساتھ چلنے والی ملتِ اسلامیہ کے خلوص و دیانت کو بار آور کر دیا، ورنہ ان حضرات نے اس تحریک کو ناکام بنانے میں، ہندوؤں سے کچھ کم تخریبی کوششیں نہیں کی تھیں۔ قوموں کی زندگی میں اس قسم کی تخریبی کوششیں کس قدر تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں، اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگایئے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوؤں نے پاکستان پر حملہ کر دیا اور ایک فیصلہ کن جنگ چھڑ گئی۔ قوم نے جسدِ واحد کی طرح دشمن کا مقابلہ کیا۔ اگر اس وقت ملک میں شر پسند عناصر کی طرف سے اس قسم کی سرگوشیاں ہونی شروع ہو جاتیں کہ ہم نے ہندوستان سے الگ ہو کر کیا پایا ہے۔ مفت میں ان لوگوں سے لڑائی مول لے لی۔ ہم سے کہا یہ گیا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ کیا یہی ہے وہ اسلامی حکومت جس کے لئے ہمیں جانیں دینے کے لئے کہا جا رہا ہے؟ اس حکومت میں اور ہندوستان کی حکومت میں بالآخر فرق کیا ہے۔ سو جب فرق کچھ نہیں تو پھر ہمارا ہندوستان کے ساتھ مل جانے میں نقصان کیا ہے — سوچئے کہ اگر اس جنگ کے دوران ملک میں اس قسم کی سرگوشیاں شروع کر دی جاتیں تو ہمارا حشر کیا ہوتا — بعینہٖ اسی قسم کی وہ جنگ تھی، جو تحریکِ پاکستان کی شکل میں لڑی جا رہی تھی۔ اس وقت اس قسم کے خیالات کا مسلمانوں میں پھیلانا اور پھیلاتے چلے جانا، ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست سے کچھ کم تباہی کا موجب نہ تھا۔

اس پس منظر میں سوچئے کہ کیا اس قسم کے غدارانِ ملت کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ پاکستان میں ان لوگوں کی صف میں کھڑے ہو جائیں جنہوں نے ان کی تمام سازشوں اور شورشوں کے باوجود حصولِ پاکستان کے لئے مسلسل جدوجہد کی اور بالآخر اسے حاصل کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی ہندوستان کی طرف سے قتل و غارت گری کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اس میں کسی کو اس قسم کے مسائل کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ ورنہ اگر پاکستان کا قیام امن و سکون کی فضا میں عمل میں آتا تو سب سے پہلے یہ سوچا جاتا کہ کیا ان لوگوں کو پاکستان آنے کی اجازت دی جائے، اور اگر دی جائے تو کن شرائط کے ماتحت۔ اس وقت کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ یہاں سب سے زیادہ معتبر بنے پھر رہے ہیں۔

کہا جائے گا کہ جب پاکستان بن گیا۔ یہ لوگ یہاں چلے آئے تو پھر ان میں اور دوسرے لوگوں میں امتیاز روا رکھنے کی کونسی وجہ جواز ہے۔ قریش مکہ نے بڑھ چڑھ کر اسلامی تحریک کی مخالفت کی لیکن جب فتح مکہ کے بعد وہ مسلمانوں میں شامل ہو گئے تو ان کے خلاف نہ کوئی انتقامی کارروائی کی گئی ، نہ کوئی امتیاز روا رکھا گیا۔

بجا اور درست۔ لیکن ان قریش مکہ نے اپنی سابقہ مخالفت کی معافی مانگی۔ اس کا اعتراف کیا کہ ان کا مسلک باطل اور طرزِ عمل ناروا تھا۔ انہوں نے اظہارِ ندامت میں اپنی گردنیں جھکا دیں اور اپنی سابقہ ذہنیت کی تمام آلائشوں کو دور کر کے نئے مسلک کے قائل اور مؤید وجاں نثار ہو گئے۔ انہوں نے یہ کہا اور ادھر سے جواب ملا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ اب تم سے سابقہ جرائم کا کوئی مواخذہ نہیں ہو گا — سوال یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی آج تک اپنے سابقہ طرزِ عمل پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے ملت سے اپنے جرائم کی معافی مانگی ہے؟ اظہارِ ندامت یا اعلانِ معافی تو ایک طرف، یہ لوگ اب تک اپنی نجی محفلوں میں پاکستان کو کوستے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ خود پاکستان نہیں آئے، ان کے معتقدین ومتبعین، پاکستان میں بیٹھے ان کی خدماتِ جلیلہ کا چرچا کرتے اور صلوٰۃ وسلام کے ساتھ ان کے تذکرے کرتے رہتے ہیں، کہا یہ جاتا ہے کہ ان حضرات کے علم وفضل کا احترام ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص ملک وملت کے ساتھ غداری کرے کیا اس کا علم وفضل اس کے لئے وجہ مدافعت قرار پا سکتا ہے؟ جب علامہ اقبالؒ نے (مولانا) حسین احمد مدنی کے متعلق کہا تھا کہ —

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

تو اس وقت مولانا مدنی کا علم وفضل ان کے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے فرمایا تھا کہ

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

تو اس "تمام بولہبی" میں ان کی قبائے فضیلت بھی شامل تھی۔ اور جب قائد اعظمؒ نے (مولانا) آزاد کو (SHOW-BOY) کہہ کر پکارا تھا تو ان کا سحرِ خطابت اس وقت بھی ان کے ساتھ تھا۔ جب اس زمانے میں ان لوگوں کا علم وفضیلت ان کی سپر نہ بن سکا تو آج ان کا علم وفضل ان کے ملت کش کارناموں کے لئے وجہ جواز کیسے بن جائے گا۔ علم وفضل کے اعتبار سے مغرب کے مستشرقین ان لوگوں سے کم نہیں۔ پھر انہیں بھی (باوجود ان کی اسلام دشمنی کے) واجب الاحترام قرار دیجئے!

یہاں تک تو بات اتنی ہی تھی کہ ان لوگوں نے اپنے سابقہ طرزِ عمل کے لئے ملت سے معافی نہیں مانگی۔ لیکن جماعتِ اسلامی تو اس سے سو قدم آگے ہے۔ مودودی صاحب نے جون ۱۹۴۷ء کے ترجمان القرآن میں لکھا تھا۔

> میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب پیدا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔

یہ تقسیمِ ہند سے دو ماہ قبل کی بات ہے۔ اس کے بعد غیرت کا تقاضا تھا کہ مودودی صاحب ہندوستان میں رہ کر اسلامی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے لیکن وہ اس کے بجائے اس پاکستان کی طرف تشریف لے آئے جہاں

بقول ان کے 'مسلمانوں کی کافرانہ حکومت قائم ہوئی تھی۔ وہ یہاں آئے تو پاکستان نے انہیں پناہ بھی دی اور روٹی بھی، اور ان سے ان کی سابقہ روش کا کوئی مواخذہ نہ کیا۔ شرافت کا تقاضا تھا کہ کم از کم پاکستان کے ارباب حل وعقد کی اس وسعت ظرف کا اعتراف کیا جاتا۔ لیکن سنیئے کہ انہوں نے اس کے بجائے کیا کیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد ترجمان القرآن کا پہلا شمارہ جون ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے 'مسلم لیگی قیادت کے خلاف انتہائی زہر اگلنے کے بعد لکھا۔

> یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔

واضح رہے کہ مسلم لیگ کی قیادت 'تحریک پاکستان کے زمانے میں قائداعظمؒ کے ہاتھ میں رہی تھی اور جس وقت مودودی صاحب کی طرف سے مندرجہ بالا 'گل فشانی' ہو رہی تھی، قائد اعظم پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ اس کے بعد مودودی صاحب یوں گویا ہوتے کہ

> اس پورے گروہ میں سے ایک کو بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد مر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے تھے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۸ء)

ذرا سوچئے کہ اگر مودودی صاحب 'ہندوستان میں پناہ لے کر یہی الفاظ وہاں کے لیڈروں کے متعلق کہتے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا!

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری قوم بڑی زود فراموش واقع ہوئی ہے۔ یہ دوست اور دشمن میں تمیز بہت جلد بھول جاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ اتنے نقصان اٹھاتی ہے۔ لیکن جن بہی خواہانِ پاکستان اور وفا شعارانِ ملت کے سینے کے یہ زخم مندمل نہیں ہوتے' اور انہیں یاد ہے کہ ان غدارانِ قوم نے تحریکِ پاکستان کے دوران کیا کیا تھا، اور اب یہ کس قسم کی سرگوشیاں اور وساوس انگیزیاں کرتے رہتے ہیں' ان کا فریضہ ہے کہ وہ قوم کو ان مارہائے آستین کی زہر چکانیوں سے آگاہ کرتے رہیں۔ تاکہ ذہن ملت میں یہ شعور بیدار رہے کہ وامتازوا الیوم ایھا المجرمون (۳۶/۵۹) غدارانِ قوم کو وفا شعاروں کی صف سے الگ رہنا ہوگا۔ اس انداز سے الگ کہ یعرف المجرمون بسیماھم (۵۵/۴۱) مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں اور دنیا دیکھ لے کہ

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا است
بندۂ غدار را مولا کجا است

اس لئے تقریب یادگار پاکستان کے سلسلہ میں خدام تحریکِ پاکستان کی طرف سے جو مطالبہ کیا گیا تھا وہ نہ صرف حق بجانب تھا بلکہ ایک اہم حقیقت کی یاد دہانی تھی جسے ملتِ پاکستانیہ کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

(دو ستمبر کی شام' واٹی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں' شہدائے پاکستان کی یاد میں' بزمِ طلوعِ اسلام لاہور' کے زیرِ اہتمام ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں پرویز صاحب نے مذکورہ صدر عنوان پر سامعین سے خطاب کیا۔ خطاب برجستہ تھا۔ جسے بعد میں ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے مرتب کیا گیا احباب پیشِ خدمت قارئین ہے)

فرشتے پونچھ لیتے ہیں مرے رخسار سے آنسو
الٰہی! آج کس کی یاد میں شبنم فشاں ہوں میں

صدرِ محترم۔ میرے عزیز بھائیو اور بہنو! سلام و رحمت۔

قرآن کریم نے انسانوں کے ایک گروہ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ــــــ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَۃِ (۱۴/۳) ان لوگوں کی نگاہیں صرف آج کے مفاد پر مرکوز ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے کل کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آج کے بدلے کل کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے نہیں جنہیں صفِ آدمیت میں کھڑا کیا جا سکے۔

دوسرے گروہ کے متعلق اس نے کہا کہ ـــ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹/۱۸) وہ ہمیشہ اپنے کل پر نگاہ رکھتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے آج کو بھی سنوارتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا وقت آجائے کہ آج کے مفادِ عاجلہ اور کل کی منفعت میں تصادم ہو جائے اور ان میں سے ایک ہی محفوظ رہ سکتا ہو' تو وہ اپنے کل کی خاطر اپنے آج کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھدار کہلاتے اور مستحقِ ستائش قرار پاتے ہیں۔

لیکن ایک گروہ اور بھی ہمارے سامنے آتا ہے ــــ یہ گروہ کون سا ہے' اس کے لئے آپ واہگہ سرحد کی طرف چلیے' آپ کو شہر سے دور کچھ فاصلہ پر' سڑک کے کنارے ایک حسین و سادہ سا مینار دکھائی دے گا اور اس پر آپ کو یہ درخشندہ الفاظ کندہ ملیں گے۔

اے اس یادگار کو دیکھنے والو! جب تم یہاں سے پلٹ کر اپنی بستیوں میں جاؤ تو لوگوں سے کہنا کہ
ہم نے اُن کے کل کی خاطر اپنا آج قربان کر دیا ہے۔

وہ لوگ جو دوسروں کے کل کی خاطر اپنا آج قربان کر دیتے ہیں' شرفِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہوتے

ہیں۔۔۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ
یہ وہ ہیں جن پر خدا درود وسلام کے پھول نچھاور کرتا ہے۔ اور یہی ہیں جو زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچانے والے راستے پر گامزن ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم آج انہی کی یاد منانے کے لئے یہاں جمع ہوتے ہیں جنہوں نے ہمارے کل کی خاطر اپنا آج قربان کر دیا اور یہ انہی کے قطراتِ خون کا نتیجہ ہے کہ ہم آج یہاں اطمینان سے بیٹھے پاکستان کا نام لیتے اور اپنی جان، مال عزت، آبرو محفوظ پاتے ہیں۔ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

—— (۰) ——

برادرانِ عزیز! آج اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنا چاہے تو اسے کلمۂ شہادت پڑھایا جاتا یا آمنت باللہ کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔۔۔ اور ہم لوگ جو پیدائشی مسلمان ہیں انہیں ان الفاظ کے دہرانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے مسلمان ہونے کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ اور وہ معاہدہ یہ ہے کہ۔۔۔ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ یہ معاہدہ کرنے والا عبدِ مومن اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور خدا اسے اس کے عوض جنت عطا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ معاہدہ یونہی نظری نہیں ہوتا کہ محض کاغذ پر لکھ دیا گیا اور اسے شرمندۂ عمل کبھی نہ ہونے دیا۔ اس عبدِ مومن کو اس معاہدہ پر کاربند ہونے کے لئے عملی شہادت دینی ہوتی ہے۔ جہاں تک مال دینے کا تعلق ہے اس کے مواقع تو ہر آن آتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب ان معاہدہ کرنے والوں کو سرکف اور کفن بدوش میدانِ جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔۔۔ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (۹/۱۱۱)۔۔۔ وہ خدا کی راہ میں (فی سبیل اللہ) جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا میدانِ کارزار میں سر دے کر اپنے معاہدے سے سرخرو ہو جاتے ہیں۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا کہ قرآن کی رو سے مسلمان کی خصوصیات کیا ہیں۔ ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہاں سے سوال یہ سامنے آتا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کہتے کسے ہیں؟۔۔۔ اس سوال کا جواب بھی قرآن کریم خود ہی دیتا ہے۔ اس جواب تک پہنچنے کے لئے ذرا تصور میں لائیے اس پس منظر کو کہ حضور نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کی جماعت کامل تیرہ برس تک مکہ میں مخالفین قریش کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ بالآخر وہ اپنے پروگرام کے مطابق مکہ کو چھوڑ کر مدینے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اب قریشِ مکہ کو کوئی وجہ پرخاش نہیں رہنی چاہیے تھی۔ ان سے کسی معاملہ میں کوئی شناسائی تھی، کوئی میل ملاقات نہیں، بات چیت نہیں۔ لیکن ہم کیا دیکھتے ہیں کہ اہلِ مکہ نے ایک لشکرِ جرار تیار کیا اور مدینہ پر چڑھ دوڑے۔۔۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔ سنئے کہ وہ اجازت

کن الفاظ میں دی گئی تھی اور ان کا وہ جرم کیا بتایا گیا تھا جس کی پاداش میں قریش انہیں مدینہ میں بھی چین نہیں دینا چاہتے تھے۔ سورۃ حج میں ہے ــــ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۔ یہ لوگ جن پر اس قدر مظالم روا رکھے گئے ہیں، انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی مدافعت کے لئے سربکف میدانِ جنگ میں اتر آئیں ــــ چونکہ یہ مظلوم ہیں، اس لئے خدا ان کی نصرت پر قادر ہے ــــ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ (۲۲:۳۹) ــــ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ ان کا کوئی جرم اور قصور نہیں تھا بجز اس کے کہ یہ کہتے ہیں کہ "ہمارا رب اللہ ہے"۔ بس یہ تھا ان کا جرم ــــ یعنی یہ کہ یہ خدا کے سوا کسی کے محکوم اور محتاج نہیں رہنا چاہتے۔ یہ اُس کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ان مخالفین کے نزدیک اُن کا یہ جرم اس قدر سنگین تھا کہ وہ انہیں ترکِ وطن کے بعد بھی چین سے بیٹھنے نہیں دینا چاہتے تھے ــــ اور یہی تھا ان "خدا کو اپنا رب کہنے والوں" کا وہ حق جس کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں اترنا قتال فی سبیل اللہ کہلایا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ۱۹۴۷ء کی جنگ اس معیارِ قرآن کے مطابق "قتال فی سبیل اللہ" کے زمرے میں شامل ہو سکتی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا اور ہندو اس کی مخالفت کیوں کرتا تھا؟

ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟ اس سوال کے جواب کے لئے آج ہماری بدقسمتی سے خود پاکستان میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اور یہ بولیاں بولی جاتی ہیں ان لوگوں کی زبان سے جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی، اور جن کے سینے میں ابھی تک یہ آگ اسی طرح سلگ رہی ہے کہ ان کی مخالفت کے باوجود پاکستان معرضِ وجود میں کیوں آگیا ــــ کوئی کہتا ہے کہ یہ جناح کا ایگو (EGO) تھا جس کی تسکین کے لئے اس نے ہندو سے لڑائی مول لی تھی۔ وہ کانگریس کی صفوں میں رہ کر جہاں گاندھی کی موجودگی میں "اوّل نمبر کا لیڈر" نہیں بن سکتا تھا اس لئے اس نے اپنی تسکینِ پندار کے لئے وہ میدان تلاش کر لیا جس میں کوئی اس کا حریف نہ ہو سکے۔ دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ نہیں صاحب! یہ انگریز کی چال تھی کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ کر جائے تو ایسی حالت میں کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مسلسل سر پھٹول کے اسباب موجود رہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ہندو کی تنگ نظری تھی جس کی وجہ سے اس نے مسلمانوں سے اچھا سلوک نہ کیا اور یوں مسلمان تنگ آکر ان سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں ــــ لیکن آیئے ہم خود (قائداعظم) جناح سے پوچھیں کہ انہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔ ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے کہ قائداعظم حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض طلباء نے آپ سے سوال کیا کہ جس انداز کی حکومت قائم کرنے کے لئے آپ پاکستان کا مطالبہ پیش کر رہے ہیں، اس حکومت کی خصوصیات کیا ہوں گی اور وہ دوسری حکومتوں سے کس طرح مختلف ہوگی۔ اس کے جواب میں جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ اس سوال کا حتمی جواب ہے کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا۔ انہوں نے کہا۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول

> ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ تھا مطالبۂ پاکستان سے مقصد!

آپ نے دیکھا کہ مطالبۂ پاکستان، دوسرے الفاظ میں "قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" کا اعلان تھا۔ ہندو کی طرف سے اس اعلان کا ردعمل کیا ہوا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسی سال، لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر (کانگریس کے مشہور لیڈر، مسٹر منشی نے (اپنے خطبہ صدارت میں) کہا کہ:

> پاکستان کے مطالبہ سے مقصد یہ ہے کہ مسلمان ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

> ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان ایسی حکومت قائم کرلیں۔

اس سوال پر ہر ذی ہوش یہ پوچھے گا کہ اگر مسلمان اپنے مساکن (HOME LANDS) میں قرآنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے تو ہندوؤں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اس سے اس قدر آتش بہ پیراہن کیوں ہو گئے؟ اس سوال کا جواب قریش کے اس حملہ سے مل سکے گا جو انہوں نے مدینہ پر کیا تھا۔ اور جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ کوئی باطل پرست، "قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" کے اعلان کو برداشت نہیں کر سکتا خواہ وہ مکے کے قریش ہوں یا ہندوستان کے ہندو۔ اس لئے کہ

> ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
> چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس مقام پر ضمناً یہ بھی سن لیجئے کہ ہندوستان کے ہندو کو تو اس کا علم تھا کہ مسلم لیگ کے زعماء پاکستان میں اس انداز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تحریک پاکستان کے مخالف مسلمانوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ لوگوں کو یہ کہہ کر ورغلایا کرتے تھے کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔
>
> (سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم
> مطبوعہ۔ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۱ھ۔ صفحہ ۲۷)

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہندو اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی خطۂ زمین میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔

آپ ذرا اس چیز کو سامنے لائیے کہ تقسیمِ ہند انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ تینوں کی رضامندی سے عمل میں آئی تھی۔ تقسیم کے اس معاہدہ پر کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو نے دستخط کئے تھے۔ ادھر انہوں نے اس معاہدہ پر دستخط کئے اور ادھر جا کر یہ بیان اخبارات میں دے دیا کہ

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر، اور دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

دوسری طرف سے، ان کے ایک اور سرکردہ لیڈر، دیوان چمن لعل، بولے۔

> میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیمِ ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دینے کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔

راجہ مہندرا پرتاب نے سنہ ۱۹۶۵ء میں یہ اعلان کیا تھا کہ

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لاینفک ہو گئی ہے۔ بنا بریں، میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

غور فرمایا آپ نے کہ "قالوا ربنا اللہ" کا جرم کس قدر سنگین ہوتا ہے؟ ہندوستان کے (سابق) چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے سلسلہ میں اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا کہ ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء ہی میں پاکستان پر حملہ کرنے کی اسکیم تیار کر لی تھی لیکن بعض داخلی مصالح کی بنا پر اس اسکیم پر اس وقت عمل نہ کیا جا سکا۔ اور وہ اب بروئے کار لائی جا رہی ہے۔

آپ سوچئے برادرانِ عزیز! کہ دسمبر ۱۹۴۷ء یا شروع ۱۹۴۸ء میں ہماری حالت کس قدر کمزور تھی۔ یہ حالت بعینہٖ ویسی تھی جیسی جنگِ بدر کے زمانے میں مدینہ کے مسلمانوں کی تھی۔ لیکن اس میں فرق یہ تھا کہ اس وقت مدینہ کے اندر کوئی مسلمان ایسا نہیں تھا جو مسلمانوں کو یہ کہہ کر ورغلاتا کہ اس جنگ میں شرکت جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ لیکن پاکستان میں ایسے مسلمان موجود تھے۔ اس وقت حکومتِ پاکستان اپنی فوجی قوت کے استحکام اور تعداد میں اضافہ کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف ملک کے اندر ایک جماعت، اسلام کے نام پر کیا کر رہی تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اپریل ۱۹۴۸ء میں جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کا ایک اجلاس ہوا جس میں انہوں نے فوج میں بھرتی ہونے کے متعلق کوئی فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کا باہر کی دنیا کو تو کوئی علم نہ ہو سکا لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد اس جماعت کے قیّم نے ایک استفسار کے جواب میں کہا کہ

> موجودہ حکومت غیر اسلامی ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔

ان کا یہ جواب، روزنامہ نوائے وقت کی ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من!

کہ "قاتلوا بنا اللہ" کی مخالفت کس کس گوشے سے ہوتی ہے!

بہرحال، ہندو اپنی تیاریوں میں معروف رہا تاآنکہ اس نے شروع ۱۹۶۵ء میں چھاڑ بیٹ کے علاقہ پر زبردستی قبضہ کر کے، پاکستان کی قوت کا جائزہ لینے کے لئے ایک حربہ استعمال کیا۔ ہندو کا یہ اقدام، دنیا کے کسی قومی یا بین الاقوامی قانون و آئین یا اخلاقی ضابطہ کی رُو سے کوئی وجہ جواز نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بھارت کے وزیر امور داخلہ، مسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے اپنی آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دے رکھا ہے۔ اور وزیر اعظم شاستری نے بڑے فخر سے کہا کہ ہندوستان کی پینتالیس کروڑ آبادی، پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لئے شمشیر بکف بیٹھی ہے۔ ہندوستان کی پینتالیس کروڑ آبادی کے مقابلہ کے لئے، پاکستان اپنی قلیل آبادی کو اسلام کے نام ہی سے آمادۂ جہاد کر سکتا تھا۔ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اور اس کی مدافعت بھی اسلام ہی کے نام سے ہو سکتی تھی۔

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت تو قائم ہی نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس کی حفاظت کے لئے اسلام کے نام پر پکارنا، اور اسے جہاد فی سبیل اللہ قرار دینا، یا جو لوگ اس جنگ و قتال میں اپنی جان دے دیں، انہیں شہداء کے زمرہ میں شمار کرنا، کس طرح صحیح سمجھا جا سکے گا؟ ہمیں معلوم ہے کہ وہ عنصر جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتا تھا۔ اور جو اب تک بھی نظریۂ پاکستان کو اپنا نہیں سکا، وہ لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے وساوس پیدا کرتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص تعصب کی پٹی الگ کر کے، سمجھنا چاہے تو بات چنداں مشکل نہیں۔ اول تو یوں سمجھئے کہ جب قریش مکہ نے مدینہ پر پہلا حملہ کیا ہے، اس وقت مدینہ میں بھی ہنوز اسلامی حکومت باقاعدہ اور آئینی طور پر قائم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جنگ تو اپنی اور مدینہ کی حفاظت کے لئے تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس جنگ کے قتال فی سبیل اللہ اور اس میں جان دینے والوں کے شہداء ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ بلکہ ان السابقون الاولون کا مرتبہ تو بہت ہی بلند ہے۔ یہ اس لئے کہ اگرچہ مدینہ میں ہنوز اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی لیکن مدینہ وہ خطۂ زمین تھا جس میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا عزم و ارادہ تھا اور اس کے لئے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ یہی حالت پاکستان کی ہے۔ اس میں ابھی تک اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ لیکن اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا ہے۔ اور پھر مملکتِ پاکستان نے اپنے آئین میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے۔ لہٰذا اس خطۂ ارض کی حفاظت، بالواسطہ، اسلام کی حفاظت ہے۔ یا آپ (مثال کے طور پر) یوں سمجھئے کہ آپ نے کسی گاؤں میں مسجد بنانے کے لئے ایک قطعۂ اراضی مخصوص کیا۔ اس پر ہنوز مسجد تعمیر نہیں ہوئی۔ لیکن گاؤں کے ہندو اور سکھ اس قطعۂ اراضی پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ اس خطۂ زمین کی حفاظت مسلمانوں کا دینی فریضہ ہو گا یا نہیں؟ یہ وجہ تھی کہ ہندو کے مذموم عزائم کے پیشِ نظر پاکستان کی حفاظت کے لئے اسلام کے نام پر اپیل کی جاتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے جماعتِ اسلامی نے اس نازک وقت میں بھی مسلمانوں کے دلوں میں وساوس پیدا کرنے کی مہم میں کمی نہیں آنے دی۔ آپ اس موقع کی نزاکت کو سامنے رکھئے اور پھر ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے۔ یعنی

> غیب کا علم تو خدا کو ہے لیکن ہمارے ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ اسلام کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اگر وہ اس کے انفرادی تقاضوں سے نہیں تو کم از کم اس کے اجتماعی تقاضوں سے ضرور گلو خلاصی کرانے کا آرزومند ہے۔ وہ اس مقصد

کروڑ بندوں کی چوٹ حاصل کرتا لیکن چونکہ قوم ابھی اس بات پر آمادہ نظر نہیں آتی اور اس بنا پر اس کے اندر قیادت وسیادت قائم کرنے کے لئے اسلام کی جبت کا دم بھرنا ناگزیر ہے، اس لئے مناسب اور ایسی معلوم ہوتی ہے کہ کافرانہ افکار و نظریات اور ملحدانہ تصورات کے ساتھ اسلام کو چپکا کے رکھا جائے۔

یہ الفاظ ترجمان القرآن کی ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئے تھے۔ اسی ستمبر کی اشاعت میں جس کی ۶ تاریخ کو ہندوؤں نے ایک سیلاب بلا کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا ـــــ آہیں ڈویژن فوج، ہزاروں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، میلوں تک مار کرنے والی بڑی بڑی توپیں۔ سر پر آندھی کی طرح چلتے ہوئے ہوائی جہاز۔

یہ اہتمام تھے اور ایک مشت پر کے لئے

قرآن کریم میں برادران! ایک ایسے ہی نازک موقعہ کا نقشہ سامنے لانے کے بعد کہا گیا ہے کہ جن لوگوں کی طرف یہ ہجوم بلا اور طوفان مصائب امنڈے چلا آرہا تھا ان کی کیفیت یہ تھی کہ

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (۳/۱۷۳)

یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ دشمن نے تمہارے خلاف ایک لشکر جرار جمع کر رکھا ہے، تو بجائے اس کے کہ وہ اس سے خوف زدہ ہوتے (اس سے) ان کا ایمان اور بڑھ گیا، اور انہوں نے دل کے پورے اطمینان اور ذہن کے پورے سکون کے ساتھ کہہ دیا کہ ـــــ خدا دارم چہ غم دارم۔ وہ ہماری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ وہ بہت عمدہ کارساز ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

عزیزانِ من! آج دنیا کے ہر فوجی مبصر اور سیاسی مدبر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی فوجی طاقت اور سامانِ حرب و ضرب میں جو تناسب اُس وقت تھا، اُس کے پیشِ نظر دنیا کی کوئی طاقت ہندوستان کو شکست دینا تو ایک طرف اس سیلاب بلا کے سامنے کھڑے ہو جانے کا بھی حوصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اس قدر حوصلہ شکن اور ہمت آزما وقت میں اہلِ پاکستان کا جو ردِ عمل ہوا اس نے ساری دنیا کے منطقی استنباطات اور ریاضی کے حسابات کو غلط کر دکھایا۔

عزیزانِ من! یہ بڑی سپاس گزاری ہوگا اگر میں سب سے پہلے اس آہنی عزم کا اعتراف نہ کروں جس سے ہماری حکومت نے اس بے پناہ یلغار کا استقبال کیا تھا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جب اس قسم کے نازک مواقع پر اس ملک کے اربابِ حل و عقد سب سے پہلے، ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اپنی حفاظت کے لئے، دوسرے ملکوں میں جا بیٹھے اور قوم کو ان بھیڑیوں کے حوالے کر گئے۔ لیکن ۶ ستمبر کی دوپہر کو صدرِ مملکت پاکستان نے جو نعرۂ تکبیر بلند کیا تھا اس کی گونج اس وقت تک ہر در و دیوار سے صدائے بازگشت کی طرح کانوں میں آرہی ہے۔ انہوں نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

پاکستان کے دس کروڑ عوام، جن کے دلوں میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے مقدس کلمات بسے ہوئے ہیں، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے

جب تک بھارتی توپوں کے دہانے ہمیشہ کے لئے سرد نہیں پڑجاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انہوں نے کس جری قوم کو چھیڑنے کی جسارت کی ہے۔ پاکستانی عوام جو اپنے مقاصد کی سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پر کامل ایمان رکھتے ہیں' اللہ کے نام پر سد واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں گے۔ نوعِ انسان کو اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت ہے کہ حق کا ہمیشہ بول بالا ہوگا۔

اس ولولہ انگیز اعلان نے قوم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ اور ساری قوم فی الواقع ایک جسدِ واحد کی طرح اٹھی اور فضائے پاکستان پر سپرین کر چھا گئی۔ ہماری فوج کے جیالے جوانوں نے جو کچھ کر کے دکھایا' وہ ایک محیر العقول اور ناممکن التصور تھا کہ (غیر تو ایک طرف خود اپنوں کی) سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ کچھ کیسے ہوگیا۔ وہ جو اس زمانے میں اس قسم کے افسانے مشہور ہو گئے تھے کہ سفید گھوڑیوں والے اور سبز پیراہنوں والے آسمان سے (اتر کر) دشمن کے بم پکڑتے اور توپوں کے گولے برساتے تھے' وہ اسی تحیر کی فراوانی اور عجز تصور کے پیدا کردہ تھے۔ وہ سب کچھ انہی خاکی وردیوں والوں نے کیا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ انہیں اس سے پہلے اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس "بال و پرِ روح الامیں" کی شہادت' برادرانِ گرامی قدر! ایک غیر ملکی کی زبان سے سنیئے۔ امریکہ کے مشہور میگزین ٹائم کا رپورٹر لوئیس کرار جنگ کے دوران' ہمارے محاذوں پر آیا تھا۔ اس نے ۲۲ ستمبر کو اپنے میگزین کو جو رپورٹ بھیجی تھی وہ سننے کے قابل ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

اس قوم کو کون شکست دے سکتا ہے جو موت سے آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو۔۔۔ میں' بھارت' پاکستان جنگ کو یاد رکھ سکوں یا نہ رکھ سکوں' لیکن میں پاکستانی فوج کے ایک نوجوان افسر کے اس تبسمِ جرأت نواز کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا (جس سے اس نے میرا استقبال کیا تھا) اس تبسم نے مجھ پر واضح کر دیا کہ پاکستان کے نوجوان کس قدر جیالے اور نڈر ہیں۔۔۔ یہ لوگ عام سپاہیوں سے لے کر جنرل آفیسر کمانڈنگ تک۔۔۔ آگ کے گولوں سے یوں کھیلتے تھے جیسے بچے گلیوں میں بنٹوں سے کھیلتے ہیں۔

میں نے جنرل آفیسر کمانڈنگ سے پوچھا کہ اس کا بالآخر راز کیا ہے کہ آپ اس قدر قلیل التعداد ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کو یوں مغلوب کئے جا رہے ہیں۔ اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا' مسکرایا اور کہا۔

"اگر حوصلہ' جرأت اور جذبۂ حب الوطنی ایسی اجناس ہوتیں جو بازار سے خریدی جا سکتیں۔ تو ہندوستانی انہیں امریکی امداد کے ساتھ حاصل کر لیتے۔" (یہ متاعِ گراں بہا بازار میں بکتی نہیں۔ یہ سپاہی کے خونِ جگر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ طلوعِ اسلام)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ ملت کے مقدر کے ان درخشندہ ستاروں نے کیا کچھ کر کے دکھایا تھا اور کس طرح کر کے دکھایا تھا۔ سچ کہا تھا اقبال نے کہ۔۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

آپ عزیزانِ من! ان تین سال کے عرصہ میں جنگِ ستمبر کے نامور مجاہدین اور شہرت یاب شہداء کے اس قدر معرکہ آراء کارنامے سن چکے ہیں کہ ان میں کسی اضافہ کی شاید ہی گنجائش ہو یا ان کے دہرانے کی ضرورت۔ کون نہیں جانتا کہ میجر خادم حسین میجر عزیز بھٹی، بریگیڈیئر شامی یا ہوا باز یونس وغیرہم کے مقدس خون نے اس قوم کو کس قدر سرخروئی عطا کی تھی۔ ان کے نقوشِ قدم زمانے کی ریگِ رواں پر درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور ہمیشہ تک جگمگاتے اور ہمارے راستے روشن کرتے رہیں گے۔ میں آج کی نشست میں عزیزانِ من! دو چار کارنامے ان گمنام مجاہدوں اور شہیدوں کے سامنے لانا چاہتا ہوں، جنہیں نہ کوئی شہرت حاصل تھی نہ کسی بلندی بام سے کوئی نسبت۔ وہ ہمارے جیوش کے عام سپاہی تھے جنہوں نے اپنی عدیم المثال قربانیوں سے خواص کا درجہ حاصل کر لیا۔ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ۔

لیکن ان کے حیرت انگیز کارناموں تک آنے سے پہلے، قرآن کریم کے دو مقامات بطورِ تمہید سامنے لانے ضروری ہیں۔ اسلام میں سپاہی کا مقام کیا ہے؟ اسے قرآن نے ایک مقام پر اس حسنِ ایجاز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے روح وجد میں آتی چلی جاتی ہے۔ وہ بدر کے میدان کا منظر سامنے لانے کے بعد کہتا ہے کہ: فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ۔ (ان غازیوں کو بتا دو کہ) دشمن کو تم قتل نہیں کر رہے تھے۔ خدا خود قتل کر رہا تھا۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸/۱۷)۔ تم ان پر تیر نہیں چلا رہے تھے، خدا خود چلا رہا تھا...... آپ نے عزیزانِ من! ملاحظہ فرمایا مسلم سپاہی کا مقام؟ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور اس کا بازو خدا کا بازو بن جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

اور اس راہ میں جان دینے والوں کے متعلق کہا کہ — وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ۔ (۲/۱۵۴)۔ انہیں تم مردہ مت کہو۔ وہ حیاتِ نو کے علمبردار ہیں۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس زندگی کی حقیقت و ماہیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

یہ تو رہا عزیزانِ من! قرآن کی رُو سے ایک مسلم سپاہی کا مقام۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ اس سپاہی کی ذمہ داریاں کیا ہیں جسے اس قدر بلند مقام عطا ہوتا ہے۔ اس ذمہ داری کو سمجھنے کے لئے تصور میں لائیے اس منظر کو کہ بدر ہی کا میدان ہے۔ رسول اللہ بنفسِ نفیس جیشِ مجاہدین کی قیادت فرما رہے ہیں۔ یہ جیش مشتمل ہے ان صحابہ کبارؓ پر جن کا ایمان بعد میں آنے والوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ اس جماعت کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ابھی ابھی حضورؐ بدرگاہِ ربّ العزت عرض پرداز تھے کہ

الٰہ العالمین! تیرے بندوں کی یہ مٹھی بھر جماعت، اپنا سب کچھ تیاگ کر، سر بکف اور شمشیر بدست

اس میدان میں صف آرا ہو رہی ہے۔ اگر آج یہ جماعت ختم ہو گئی تو پھر قیامت تک تیرا نام بلند کرنیوالا کوئی نہیں رہے گا۔

یہ ہے اس جماعت کی اہمیت۔ لیکن اس کے باوجود عین اُس وقت جبکہ ان کی صفیں سیدھی کی جا رہی تھیں یہ آیت نازل ہوتی ہے کہ

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (۸/۱۶)

آج کے دن جس نے ان میں سے پیٹھ دکھائی — بجز اس کے کہ وہ پینترا بدلنے کے لئے ایسا کرے یا اپنی پارٹی سے ملنے کے لئے۔ وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہو گیا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

آپ نے پہلے سپاہی کا درجہ بلند دیکھا تھا۔ اب آپ نے اس کی ذمہ داری کی بھی ایک جھلک دیکھ لی۔ درحقیقت وہ بلند مدارج بھی اسی عظیم ذمہ داری کے فطری نتائج ہوتے ہیں۔

بدر کے جیش اسلامیہ میں سے کسی ایک نے بھی میدانِ جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی تھی — اور ایسا ہو کیسے سکتا تھا — اور یہ حقیقت ہمارے لئے باعثِ ہزار افتخار ہے کہ ستمبر کی سترہ روزہ جنگ میں بھی ایک واقعہ ایسا سامنے نہیں آیا جس میں ہمارے صف شکن مجاہدین میں سے کسی نے دشمن کو پیٹھ دکھائی ہو۔ پیٹھ دکھانا تو ایک طرف وہاں کیفیت یہ تھی کہ — سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا — انہیں اگر زخمیوں کی حالت میں بھی ہسپتال کی طرف لایا جاتا تھا تو وہ اس کے خلاف مجسّم صدائے احتجاج بن جاتے تھے اور اپنے ساتھیوں اور افسروں کی منت سماجت کرتے تھے کہ انہیں میدان سے واپس نہ لیجائیں۔ دو ایک واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

بلوچ رجمنٹ کا لانس نائیک غلام مرتضٰی زخمی ہو کر ہسپتال میں لایا گیا۔ اس سے جا کر اسٹریچر دیا گیا تو اس نے بگڑ گیا اور کہا کہ صاحب! جنگ کے تیسرے دن میرا پاؤں ٹینک کے گولے سے ٹخنے سے کٹ گیا۔ پٹی میرے پاس تھی میں نے ٹانگ پر باندھ لی اور مارفیا کا انجکشن لے لیا۔ اس کے بعد میں حسبِ معمول مشین گن سے دشمن پر فائر کرتا رہا۔ ان لوگوں کو دیکھئے کہ یہ مجھے خواہ مخواہ وہاں سے اٹھا کر ہسپتال لے آئے ہیں۔ میں نے ان کی ہزار منتیں کیں۔ انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا پاؤں کٹا ہے، ہاتھ تو نہیں کٹا جس سے میرے فائر کرنے میں فرق پڑ گیا ہو۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ سوچئے کہ یہ کس قسم کے مسلمان ہیں!

اللہ اکبر! یہ تھے پاک فوج کے مردِ مجاہد!!

اسی غلام مرتضٰی سے پوچھا گیا کہ تم لوگ پاٹا پور کی سرحد کے ادھر کھڑے لڑ رہے تھے۔ ملٹری سٹریٹیجی کا تقاضا تھا کہ تم ذرا پیچھے ہٹ کر لڑتے، تم پیچھے کیوں نہ ہٹے۔ سوال آپ نے سن لیا۔ اب برادران! اس ان پڑھ سپاہی کا جواب سن لیجئے۔ اس نے کہا کہ پیچھے کہاں ہٹتے۔ پیچھے تو لاہور تھا اور لاہور میں ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، ہماری عزتیں اور آبروئیں لئے کر بیٹھی تھیں۔ سرحد پر کھڑے ہو کر ان کی حفاظت کرتے یا فوجی سٹریٹیجی کو دیکھتے! وہ وقت کھڑے رہ کر جانیں دینے یا آگے بڑھنے کا تھا۔ پیچھے ہٹنے کا نہیں تھا۔

اور اب ہمارے سامنے آتے ہیں سکوڈرن لیڈر شبیر عالم صدیقی (شہید) — جام نگر کا ہوائی اڈہ سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ اہم تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ہوائی حملہ کی ایک ہی یلغار میں اسے ختم کر دیا جائے۔ اور اسے اسی طرح ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ صرف ایک ایک ہوا باز باری باری جائے اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے اُسے تباہ کر کے واپس آ جائے — جانا ایک ایک نے باری باری تھا۔ لیکن شبیر عالم صدیقی بقدر دو دفعہ گیا۔ اور تیسری بار جانے کے لئے پھر مصر ہوا۔ افسر نے کہا کہ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ بہ سماجت کہا کہ صرف ایک بار اور۔ اس جھپٹ سے جس قدر خون میں تیزی آتی ہے ایسی لذت کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسے اس وعدہ پر اجازت دی گئی کہ اس کے بعد اسے مطلقاً جانے نہیں دیا جائیگا۔ اس نے سلام کیا اور کہا کہ ہاں! اب کے واپس آؤں تو پھر نہ جانے دینا۔

اور شبیر عالم صدیقی پھر واپس نہ آیا — خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را — ایئر مارشل نور خان نے کہا تھا کہ میری مشکل یہ نہیں تھی کہ میں اپنے ہوا بازوں کو کس طرح اڑنے کے لئے بھیجوں، میری مشکل یہ تھی کہ انہیں کس طرح اڑنے سے باز رکھوں۔ یہی شکایت توپ خانے کے افسروں نے کی۔ انہوں نے کہا کہ مسلسل گولہ باری سے توپیں سخت گرم ہو جاتیں۔ توپچیوں کے ہاتھ جل جل جاتے، ان میں چھالے پڑ جاتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے گولہ اندازی بند کر دو، تو وہ کہتے کہ توپوں کے خاموش ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم میدان جنگ سے بھاگ اٹھے ہیں ہم ایسا نہیں کریں گے، ہم دشمن کو ایسا تاثر نہیں دینگے — جب ایک سپاہی سے کہا گیا کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ جو سپاہی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگے گا تو وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ تو اس نے کہا کہ آپ کو صرف اتنا ہی معلوم ہے اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ اگر میں نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا دی تو میں تو بعد میں جہنم میں جاؤں گا، میرا سارا ملک اس سے پہلے نذرِ آتش ہو جائے گا۔ میں اسے کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس لئے ہم اس دن کیسے پیٹھ دکھا سکتے تھے۔

اور یہ دیکھئے، میرپور (آزاد کشمیر) کے نائک غلام رسول! یہ مرد میدان رات کے وقت گشت پارٹیوں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ دلدل، پانی، ہر کنڈے — ایک دفعہ مسلسل بارہ دن اور بارہ راتیں دلدل اور پانی میں پھرتا رہا۔ بالآخر پاؤں بے حد بوجھل ہو گئے۔ کہنے لگا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پاؤں کو کیا ہو گیا ہے۔ بوٹ کھول کر دیکھا تو پاؤں کی انگلیاں جھڑ چکی تھیں۔ اور ٹخنے کی ہڈی ننگی ہو رہی تھی۔ اسے پیچھے جانے کو کہا تو کہنے لگا کہ گھر والوں سے جا کر کیا کہوں گا کہ نہ مجھے گولی لگی، نہ سنگین کا زخم کھایا، نہ کہیں سے خون بہا، نہ ہڈی ٹوٹی۔ محض پاؤں کی انگلیاں جھڑوا کر گھر آ گیا ہے۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔ خدا کے لئے مجھے اس ندامت سے بچاؤ۔

نائیک برکت علی شہید کو میدان میں گولیاں لگیں — کچھ ران میں، کچھ پیٹ میں — ران کے زخموں پر جلدی سے پٹی باندھی اور پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ساتھیوں نے دیکھا کہ اس کے جسم سے لہو فوارے کی طرح چھوٹ رہا ہے۔ اسے پکڑا اور کہا کہ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ کہنے لگا کہ ران میں گولی لگنے سے کون ہسپتال جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے پیٹ میں بھی تو گولیاں لگی ہیں۔ کہنے لگا کہ وہ ایک طرف سے لگی تھیں، دوسری طرف سے نکل گئیں۔ وہ کون سی پیٹ کے اندر بیٹھی ہیں — اور وہ چھ گھنٹے بعد ہسپتال کی میز پر کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے جنت الفردوس کی طرف روانہ ہو گیا —

خوشش باش دمے کہ زندگانی این است!

ایک اور نوجوان کی کہانی سنیئے — بلوچ رجمنٹ کا میجر گل، بی۔آر۔بی نہر کی سائفن پر زخمی ہو گیا۔ لانس نائیک سید علی اس کے ساتھ تھا۔ بھاری ایمونیشن اٹھائے، بمشکل قدم قدم چل رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے زخمی افسر کو کیسے چھوڑ دیتا۔ ایمونیشن الگ کیا اور میجر کو کندھے پر اٹھا کر چل دیا۔ میجر بھاری جسم کا تھا اور سید علی منحنی سا نوجوان۔ تین دن کا پیاسا۔ تھکا ماندہ۔ چہرہ زرد، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں — میجر گل نے کہا کہ جب اس نے سید علی کی یہ حالت دیکھی تو اس سے کہا کہ مجھے زمین پر لٹا دو اور خود کہیں جا کر پانی پی آؤ۔ کہنے لگا کہ صاحب! مجھے پیاس نہیں۔ اور یہ کہہ پھر آگے چل پڑا۔ میجر گل نے ایک تدبیر سوچی۔ اس سے کہا کہ سید علی مجھے پیاس لگی ہے، کہیں سے پانی لے آؤ۔ وہ اسے زمین پر لٹا کر، پانی کی تلاش میں گیا تو میجر گل سرکنڈوں کے پیچھے سرکتے سرکتے اپنے کیمپ کی طرف چل دیا۔ جب سید علی پانی لے کر آیا تو وہاں میجر گل موجود نہ تھا۔ اب وہ پانی ہاتھ میں لے کر میجر کی تلاش میں دیوانہ وار پھرنے لگا۔ اس کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ جب ہم اس سے کہتے کہ سید علی تم ایک گھونٹ پانی تو پی لو تو وہ کہتا کہ میجر گل پیاسا شہید ہو گیا۔ مجھے پانی پیتے شرم نہیں آتی۔ بس اتنا کہنے کے بعد اس پر پھر خاموشی طاری ہو جاتی۔ اس نے چوبیس گھنٹے اسی طرح گزارے اور پھر میدانِ جنگ میں، ایک لفظ زبان سے کہے بغیر، دشمن کا مقابلہ کرتے، سینے میں گولی کھا کر شہید ہو گیا۔

ایک سپاہی سے پوچھا گیا کہ تم میدانِ جنگ میں اکیلے کس طرح لڑے۔ اس نے کہا کہ ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں، فوجوں کی بھاگ دوڑ سے اس قدر گرد و غبار اٹھا کہ ایک کو دوسرا نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میری پلٹن کے باقی سپاہی سب شہید ہو گئے ہوں اور ملک کی حفاظت کا بوجھ مجھ اکیلے کے کندھوں پر آ پڑا ہو۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو اپنی پلٹن سمجھ لیا۔ اور دیوانہ وار لڑتا چلا گیا۔ جب گرد و غبار چھٹا تو معلوم ہوا کہ ہر سپاہی نے کچھ ایسا ہی سمجھ لیا تھا۔ اس لئے ہر سپاہی ایک پلٹن بن کر لڑتا رہا۔

عزیزانِ من! یہ تھی ان جیالوں کی جرأت و بسالت اور یہ تھا ان کا جذبۂ ایثار و قربانی — اور یہ تمام مظاہرے ہوتے تھے ان کی طرف سے جنہیں ہم لوگ (معاف فرمائیے) اس سے پہلے (اپنی حماقت سے) "فوجی بیوقوف" کہا کرتے تھے، اور اس کے بعد "ٹیڈی بائیز" کہہ کر ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ہماری ہزار دانش اطواریاں ان دیوانوں پر نثار، اور ہمارے لاکھ تقوے ان ٹیڈی بائیز پر نچھاور۔ انہوں نے میدانِ جنگ میں جرأت و شجاعت ہی کا مظاہرہ نہیں کیا، کیریکٹر بھی اتنا بلند پیش کیا جس کی مثال بمشکل ملے گی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ

EVERY THING IS FAIR IN LOVE AND WAR.

جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے

اور جھوٹ بولنے کے متعلق، تو ہمارے ہاں کے مفتیانِ عہدِ حاضر، کا فتویٰ یہ ہے کہ زندگی کی ضرورتوں کا تقاضا ہو تو جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ اور اس کی سند میں دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دشمن کی قید میں جھوٹ بول کر جان بچانا واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے یہ نوجوان تھے کہ انہوں نے ان "مسلمات" کو توڑ کر رکھ دیا — ہمارے جس قدر فوجی دشمن کی قید میں گئے، کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ انہوں نے جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی ہو۔ ان پر روح فرسا مظالم توڑے گئے۔ انہیں جانگسل اذیتیں پہنچائی گئیں۔ ان پر لرزہ انگیز تشدد ہوتا رہا — لیکن

انہوں نے صرف اپنا نمبر اور رجمنٹ کا نام بتایا اس سے زیادہ جو کچھ پوچھا گیا اس کے متعلق کہہ دیا کہ جھوٹ ہم نے بولنا نہیں کہ ہم مسلمان سپاہی ہیں اور سچ ہم نے کہنا نہیں کہ اس سے ہمارے فوجی راز فاش ہونے کا خطرہ ہے۔

دشمن کی قید میں تو ایک طرف، ہمارے سپاہیوں نے کسی اور حالت میں بھی جھوٹ نہیں بولا۔ کمپنی کمانڈر نے صوبیدار عبدالحمید سے کہا کہ شاباش۔ آفرین، تم نے دشمن کے تین ٹینک تباہ کر دیئے۔ میں تمہارے لئے بہادری کا بہت بڑا انعام تجویز کر رہا ہوں۔ صوبیدار نے کہا کہ صاحب! تین ٹینک نہیں۔ میں نے صرف ایک ٹینک تباہ کیا ہے۔ افسر نے کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے تین ٹینک جلتے ہوئے دیکھے ہیں۔ صوبیدار نے کہا کہ صاحب! ان میں دو بکتر بند گاڑیاں تھیں۔ ٹینک ایک ہی تھا۔

باقی رہا ہمارے فوجیوں کی پاکیزہ کا کردار سو اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے۔ جنگ کے زمانے میں سینکڑوں نوجوان عورتیں اور لڑکیاں ان کی تحویل میں آئیں۔ یہ ان بستیوں میں بھی گھومے پھرے جہاں سے دشمن کے تمام مرد بھاگ گئے تھے اور صرف عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ بیسیوں مقامات پر تنہا عورت ان کی گرفت میں آ گئی۔ انہوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود دشمن کی زبان سے سنیئے۔ جنگ کے بعد بھارت کے وزیر دفاع، مسٹر چوہان نے اپنی لوک سبھا میں یہ اعلان کیا تھا کہ

> اس سترہ روزہ جنگ میں کوئی ایک واقعہ بھی ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کی طرف میلی نگاہ سے دیکھا تک ہو۔

کہیئے اپنا بھرا فقام سے کہ اس قسم کی کوئی مثال اپنے ہاں سے پیش کر کے دکھائیں۔

(۰)

یہ تو تھا ہماری افواج کا ضبط و انضباط اور کردار و اطوار۔ خود قوم نے جس طرح جسدِ واحد کی طرح، اس خطرہ کا مقابلہ کیا وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ اپنی عورتوں کو میدانِ جنگ میں ساتھ لے جاتے تھے۔ وہ وہاں رجز پڑھا کرتی تھیں کہ کوئی سپاہی میدان سے پیٹھ دکھا کر نہ جائے۔ ہماری فوجوں کے ساتھ عورتیں میدانِ جنگ میں تو جا نہیں سکتی تھیں، لیکن انہوں نے پیچھے رہ کر جس ہمت اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ـــ بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں ـــ میدانِ جنگ میں ایک سپاہی کے ہاتھ کو دیکھا گیا کہ اس میں تازہ مہندی رچی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ میری شادی میں تین دن باقی تھے کہ جنگ کا اعلان ہو گیا۔ اور میں واپس آنے لگا تو میری والدہ اور ہمشیرہ نے اپنی خوشی پوری کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مہندی لگائی۔ میری منگیتر اپنے ہی گھر کی لڑکی تھی۔ وہ لجاتی شرماتی، گھونگھٹ نکالے، آہستہ آہستہ آئی اور اپنی چھنگلی کا ایک قطرۂ خون میری مہندی میں ٹپکا کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میں گھر سے روانہ ہوا تو پیچھے سے آواز آئی کہ میدان میں جانا تو پیچھے کا خیال نہ کرنا۔ ایسے مواقع، زندگی میں کبھی کبھی آیا کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ آواز میری ماں کی تھی، بہن کی تھی یا میری منگیتر کی۔ آواز کسی کی بھی تھی، اس نے میری رگوں میں بجلیاں دوڑا دیں۔ جنگ کے ہر محاذ میں وہ آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی تا آنکہ آج اللہ نے مجھے شہادت کا درجہ دے دیا۔ یہ میرے گاؤں کا پتہ ہے۔ اگر ہو سکے تو میری منگیتر تک میرا یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ میں نے تمہارے قطرۂ خون کی لاج رکھ لی ہے۔

نارووال سیکٹر میں، ایک گاؤں سے باہر دو تین فرلانگ کے فاصلے پر توپیں گڑی ہوئی تھیں اور گولے چھوٹ رہے تھے۔ ایک توپچی کا بیان ہے کہ ہم نے کھیتوں میں سے کسی انسان کو رینگتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ پہلے تو کچھ خطرہ محسوس کیا لیکن پھر نظر آیا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ رینگتے رینگتے قریب آئی۔ اور روٹیوں کی "چنگیر" ہماری طرف بڑھا کر کہنے لگی ـــ تو ویرو روٹی کھا لو ـــ ہم نے اس سے کہا کہ بہن! تو نے یہ کیا کیا۔ اتنے خطرے میں یہاں تک آگئیں ہمیں یہاں روٹی مل جاتی ہے۔ کہنے لگی کہ ٹھیک ہے لیکن گھر کی پکی تو نہیں مل سکتی۔ ہم نے روٹی لے لی۔ ہیں نے یونہی اپنے ساتھی سے کہا کہ لسی پئے بہت دن گذر گئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ وہی بہن، گولوں کے دھماکوں سے بھرے ہماری طرف رینگتے رینگتے آ رہی ہے۔ ہم نے ڈانٹ کر کہا کہ پاگل ہو گئی ہے۔ اس آگ کے طوفان میں پھر کیوں آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں لسی کا "کڑوا" تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کو لسی پلانے آئی تھی۔ ہمارے لئے مشکل ہو گئی کہ اسے بحفاظت گاؤں تک واپس کیسے پہنچائیں۔

یہ تھیں برادرانِ عزیز! اس ملت کی بیٹیاں!

اور کھیم کرن سیکٹر کے اس واقعہ کو کون بھلا سکے گا جسے میں نے سال گذشتہ بھی، اسی مقام پر بیان کیا تھا۔ فوج کے سپاہی ایک گاؤں کے قریب سے گزرے تو گاؤں کی عورتیں باہر نکل آئیں۔ جمعدار کا بیان ہے کہ بڑی بوڑھی عورتیں ہمیں دعائیں دینے لگیں۔ اور جوان بہنوں نے کہا کہ "ویرو! جیہڑی تہاڈی کنڈ اسیں ویکھی اے، خدا کرے تے دشمن ایہہ کنڈ کدی نہ ویکھے" ـــ یہ تمہاری پیٹھ جو ہم نے دیکھی ہے، خدا کرے کہ دشمن اسے نہ دیکھ سکے ـــ آگے بڑھے تو گاؤں کی چند ایک جوان لڑکیاں بھی راستے میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے اپنی "چُنیاں" (دوپٹے) سپاہیوں کی طرف پھینکیں اور کہا کہ ـــ بھراؤ! بھیناں دیاں چُنیاں دی لاج رکھنا ـــ بھائیو! اپنی بہنوں کے ان دوپٹوں کی لاج رکھنا ـــ جمعدار کا بیان ہے کہ میرے سپاہیوں نے ان دوپٹوں کو مقدس امانت کے طور پر اپنے پاس رکھا اور ہم جس جس جگہ بھی جنگ میں گئے اس امانت کی حفاظت ہمارے لئے جزوِ ایمان بن گئی۔ میری پلٹن کے تین سپاہی شہید ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان دوپٹوں کو اپنی فولادی ٹوپیوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا ـــ

یہ تھے جذبات تمہاری بچیوں اور بہنوں کے، جنگ کے دنوں میں!

اور آخر میں، میرے عزیز بھائیو! بالخصوص میری بہنو اور بیٹیو! میں اُس شہید کی ماں کے حوصلہ و ہمت کی داد دینا اور آپ سے خراجِ تحسین لینا چاہتا ہوں جس سے قومیں دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوتی ہیں۔ یہ بیان ہے فوج کے ایک جمعدار کا۔ اس نے کہا کہ ہمارے گاؤں میں ایک بیوہ عورت کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ فوج میں جانے کے لئے مُصر ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ بیوہ عورت کی زندگی کا ایک ہی سہارا ہے۔ یہ اس کے پاس رہے تو اچھا ہے۔ لیکن اس نے ایک نہ مانی اور میرے ساتھ ہی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے چلا آیا۔ جنگ چھڑی تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس بے جگری سے لڑا کہ اس کے ساتھی عش عش کر اٹھے۔ سینے میں گولی لگی۔ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اتنے میں دشمن کا ٹینک آ گیا اور اس کی لاش کو کچلتے ہوئے آگے نکل گیا۔ جنگ ختم ہوئی اور میں گاؤں آیا۔ آنے کو تو میں آ گیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی ماں بیچاری کو اس کی شہادت کی خبر کیسے دے سکوں گا۔ مغموم سہما ہوا اس کے ہاں گیا اور سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس

نے صرف اتنا پوچھا کہ کیا میرے بیٹے نے میدان سے بھاگتے ہوئے جان دی تھی۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ وہ تو بہادروں کی طرح لڑا اور شیر کی طرح سینے میں گولی کھا کر شہید ہوا۔

اس پر اس نے کہا کہ بھائی میں سمجھ نہیں سکی کہ پھر تم روتے کیوں ہو۔ تمہیں خوش ہونا چاہیئے اور خوشی خوشی مجھے یہ خبر سنانی چاہیئے۔ جو سپاہی خدا کی راہ میں سینے میں گولی کھا کر شہید ہوا ہے اس پر خوشیاں منانی چاہئیں یا آنسو بہانے! میں یہ سن رہا تھا اور حیرت میں ڈوب رہا تھا کہ یا اللہ! کیا ہمارے دیس میں اس قسم کی مائیں بھی موجود ہیں۔

پھر اس نے پوچھا کہ میرے لال کی قبر کہاں ہے؟ اس پر میں پھر خاموش ہو گیا تو وہ نہایت سکون و اطمینان سے اپنی انگلی اپنے سینے کی طرف لے گئیں اور انتہائی وقار سے کہا کہ

> شہید کی قبر اس کی ماں کے سینے میں ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر قبر مٹ سکتی ہے لیکن اس قبر کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔

عزیزانِ من! یہ تھیں اس قوم کی بیٹیاں اور اس کے قابلِ فخر سپوتوں کی قابلِ رشک مائیں! لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے یہ کچھ کس طرح کر کے دکھا دیا تھا؟ یہ بھی سن لیجئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ

> وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا۔ (۴/۷۵)

> اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ حالانکہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ کمزور و ناتواں مرد، عورتیں، بچے چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے۔ (ہم بالکل بے کس اور لاوارث ہیں) ہمارے لئے اپنے ہاں سے کوئی مددگار اور کوئی سہارا بھیج۔

قرآن کریم کی آیت آپ نے سن لی۔ اب اس کی تشریح سنیئے۔ کرنل ستیال کی زبانی۔ وہ راوی ہیں کہ ۸ ستمبر کی شام کیمپ میں بیٹھا تھا کہ ایک بوڑھا سا آدمی اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت اس طرح میرے پاس آئے جیسے کسی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ہوں۔ اس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ہی اس رجمنٹ کے کمانڈنٹ ہیں۔ جب میں نے ہاں کہا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بڑھیا بے ساختہ میرے پاؤں پر گر پڑی۔ میرے بوٹوں کی مٹی اپنے ہاتھوں پر ملی اور اسے سر آنکھوں سے لگایا ــــ مجھ پر تو یوں ہوا جیسے کوئی بجلی گر گئی ہو۔ میں نے جھٹ سے اسے اٹھایا اور کہا کہ تم تو میری ماں ہو۔ یہ تم نے کیا کیا؟ اس کے ساتھی بوڑھے نے کہا کہ یہ آپ کو میں بتاتا ہوں کہ اس نے کیا کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ۸ ستمبر کی صبح دشمن نے ہمارے گاؤں ــــ ڈیارہ ــــ کو خالی کرایا ہے تو وہ گاؤں کی باقیماندہ آبادی کو ہانک کر باہر میدان میں لے گئے۔ انہوں نے ہم مردوں کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے۔ بوڑھی عورتوں کو ایک طرف کھڑا کر کے کہہ دیا کہ انہیں گولی سے اڑا دیا جائے۔ اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کو الگ کر کے حکم دیا کہ انہیں سرحد کے پار لے جا کر

سپاہیوں میں بانٹ دیا جائے۔ ہم میں سے ایک آدمی نے ان سے کہا کہ یہ تمہاری انتہائی کمینگی ہے۔ کم ازکم ہم مردوں کے ہاتھ کھول دو تو ہمیں اس کی تو تسکین ہو جائے کہ ہم نے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت میں جان دی ہے۔ ایک سپاہی نے بندوق کا کندہ مار کر اس کا جبڑہ توڑ دیا۔ وہ درندے ان معصوم بچیوں اور باعصمت لڑکیوں کی طرف لپکے۔ اس وقت ہماری بے کسی کا یہ عالم تھا کہ زمین کانپ رہی تھی، آسمان ہل رہا تھا۔ وہ معصوم لڑکیاں بے ساختہ سجدہ میں گر گئیں، اور رو رو غم میں ڈوبی ہوئی آواز سے کچھ اس طرح سے خدا سے فریاد کی کہ ہمیں محسوس ہوا کہ گویا خدا کا عرش کانپ اٹھا ہے کہ اتنے میں اُدھر سے ایک گولا آیا اور اس نے دشمن کی فوج میں تہلکہ مچا دیا۔ دشمن کو اپنی پڑ گئی۔ عورتوں نے اُٹھ کر ہمارے ہاتھ کھولے اور ہم ان سب کو لے کر بحفاظت نہر کے اس پار پہنچ گئے۔ یہ بڑھیا یوں سمجھ ان سب کی نمائندہ ہے۔ یہ دو دن سے اُس "اللہ کے فرشتے" کو ڈھونڈ رہی تھی جس نے ایسے وقت میں انہیں بچایا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ ہڈیارہ کا یہ واقعہ ہماری سترہ روزہ جنگ کا پورا پورا نقشہ سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ اگر ہمارے ان جاں سپار مجاہدین کے گولے بروقت آتش بار نہ ہوتے، تو پورے کا پورا پاکستان 'ہڈیارہ' بن جاتا۔ اُف! کس قدر جگر پاش ہے اس کا تصور بھی! کیا ہم ان شہیدوں اور غازیوں کے احسان سے کسی صورت میں بھی سبکدوش ہو سکتے ہیں؟

———— (۰) ————

انہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے جنگ جیت لی۔ لیکن عزیزانِ من! جنگ ختم نہیں ہوئی۔ جنگ کے بعد جب صلح کی گفت و شنید ہو رہی تھی تو ہندوستان کے وزیر دفاع' مسٹر چون نے ایک بیان میں کہا تھا کہ

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مٹنے یا جینے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

چون نے سچ کہا تھا۔ اس لئے کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

یہ جنگ تو حق کے کامل غلبہ اور باطل کی کلّی شکست کے بعد ہی ختم ہوگی۔ لیکن ہم نے تو ایسا نہیں سمجھا۔ ہم تو اس جنگ کے بعد ایسے مطمئن ہو کر اپنی لوٹ مار میں مصروف ہوئے ہیں گویا اب ہمیں نہ کسی قسم کا خوف ہے نہ خطرہ۔ یاد رکھیئے۔ دنیا میں زندہ رہنے والی قوموں کے یہ انداز نہیں ہوتے۔ ان کے انداز کیا ہوتے ہیں؟ اس کے متعلق حضور نبی اکرمؐ نے ایک جامع اور نہایت بلیغ فقرہ میں ساری بات سمو کر رکھ دی جب فرمایا کہ

> مومن کی زندگی یہ ہے کہ جب جہاد (قتال) ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف رہے۔

اور یہ ارشادِ نبویؐ درحقیقت ترجمان ہے اس آیۂ جلیلہ کا جس میں فرمایا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ
فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ (۹/۳۸)

اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں باہر نکلو تو تمہارے پاؤں زمین کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ کیا تم نے کل کے مقابلہ میں آج کو ترجیح دے دی ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو اتنی بات یاد رکھو کہ آج کے مفادِ عاجلہ کل کی سرفرازیوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

اور اس کے بعد فرمایا:-

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ
وَلَا تَضُرُّوْهُ شَـيْـــًٔا ۭ (۹/۳۹)

اگر تم جہاد کے لئے نہ نکلے تو تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی اور تم خدا کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! فطرت کی تعذیر اس قوم کے لئے جو جہاد کی طرف سے غافل ہو کر اپنی عیش پرستیوں اور تن آسانیوں میں لگ جاتی ہے۔ یاد رکھیئے! قوموں کی مادی ترقیاں اپنی جگہ نہایت ضروری، اہم اور درست۔ لیکن اگر ان کے ساتھ، قوم کی رگوں میں خونِ زندگی نہ دوڑے، تو یہ تمام ترقیاں، تنزل کا موجب بن جایا کرتی ہیں۔ اس لئے کہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

انسپکٹر جنرل پولیس (مغربی پاکستان) کا شکریہ

طلوعِ اسلام نے اپنی اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں حکومت کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرائی تھی کہ محکمہ پولیس کے نچلے درجہ کے ملازمین کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور ان میں اضافہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ آئی۔ جی۔ پولیس، محترم میاں بشیر احمد صاحب نے اس خوش کن امر کا اعلان فرمایا ہے کہ ان ملازمین محکمہ پولیس کی تنخواہوں میں اضافہ کا سوال حکومت کے زیرِ غور ہے۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۸ء)

اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ فرمائی کے لئے ہم میاں صاحب موصوف اور دیگر متعلقہ اربابِ حل و عقد کے بدل شکرگزار ہیں۔ اور استدعا کرتے ہیں کہ جب انہوں نے اس سوال کو درخورِ اعتنا سمجھا ہے تو اس پر عمل درآمد میں تاخیر نہ فرمائی جائے۔ کیونکہ عملے کے دل میں توقعات کو بیدار کرکے، فیصلہ میں تاخیر یاس انگیزی کا موجب ہوتی ہے۔

باب المراسلات

۱۔ طلوعِ اسلام اور فکر و نظر

راولپنڈی سے قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب رقمطراز ہیں:۔

"طلوعِ اسلام اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کے ترجمان 'فکر و نظر' میں جو بحث سنت کے متعلق چل رہی ہے میں اس کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ موضوع نہایت اہم ہے۔ اور میرے نزدیک جب تک اس مسئلہ کا حل نہیں ملتا' نہ تو پاکستان میں کوئی ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے' نہ ہی موجودہ خلفشار مٹ سکتا ہے۔ طلوعِ اسلام جو مطالبہ پیش کرتا ہے وہ میرے نزدیک بالکل صاف اور واضح ہے۔ یعنی یہ کہ

(۱) پاکستان کے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت میں کوئی ایسا قانون رائج نہیں ہوگا جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو۔

(۲) جب یہ سوال کسی عدالت میں پیش ہوگا کہ فلاں قانون قرآن و سنت کے خلاف ہے یا نہیں' تو عدالت کو لامحالہ اس کے فیصلے کے لئے کسی کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جس طرح اسے یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ فلاں قانون آئینِ پاکستان (کانسٹی ٹیوشن) کے مطابق ہے یا نہیں' مملکت کے اس کانسٹی ٹیوشن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو کتابی شکل میں عدالت کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ اگر وہ کانسٹی ٹیوشن کتابی شکل میں عدالت کے پاس نہ ہو تو اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہوگا کہ وہ قانون' کانسٹی ٹیوشن کے مطابق ہے یا نہیں۔

(۳) جہاں تک قرآن کا تعلق ہے' وہ ایک کتاب کا نام ہے جو عدالت کی میز پر موجود ہو سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کسی عدالت کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ فلاں قانون سنت کے مطابق ہے یا نہیں تو وہ کس کتاب کی طرف رجوع کرے گی۔

(۴) طلوعِ اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہی ہے کہ جس طرح قرآن شریف ایک کتابی شکل میں موجود ہے' اسی طرح ایک ایسی کتاب بھی ہونی چاہیئے جس میں سنت رسول اللہ کا ایسا مجموعہ موجود ہو جو (قرآن شریف کے مثل کی طرح) تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہو۔

یہ ہے میرے نزدیک طلوعِ اسلام کا مطالبہ۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ مطالبہ ایسا ہے جسے سمجھنے کے لئے کسی رازی کے دماغ کی ضرورت ہو یا اس کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی حاجت۔ بات صاف ہے اور اس کا جواب دو ٹوک ہونا چاہیئے کہ ایسی کتاب موجود ہے یا نہیں۔ اگر موجود نہیں تو پھر آئینِ پاکستان کی مذکورہ صدر شق ناممکن العمل ہے۔

پڑھ لینے مناظروں کا تو مجھے علم ہے کہ وہ بات کو سمجھ چکنے کے باوجود اس کا کبھی دو ٹوک جواب نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ اسے اور الجھا دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مناظرے سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ تحقیقاتِ اسلامیہ جیسا ادارہ جس کے متعلق کم از کم میرا یہ حسنِ ظن تھا کہ یہ لوگ معقول بات کرتے ہیں ــــ پرانے مناظروں سے بھی زیادہ الجھاؤ پیدا کرنے والا ثابت ہوا۔ فکر و نظر نے جو کچھ پہلے لکھا وہ بھی کچھ کم الجھا ہوا نہیں تھا لیکن اس کے ستمبر کے پرچہ میں جو کچھ شائع ہوا ہے اس نے پریشانیٔ فکر و نظر کی انتہا کر دی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ بات سمجھ نہیں سکے۔ یہ دو ٹوک جواب دینا نہیں چاہتے اس لئے بحث کو خواہ مخواہ غیر متعلقہ باتوں میں الجھا رہے ہیں۔ یہ اپنے موقف کے حق میں جو دلیل پیش کر رہے ہیں وہ اس موقف سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ دلیل یہ ہے کہ:

(۱) قرآن شریف کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ لیکن اس کی تعبیر میں بڑا اختلاف ہے۔ اس لئے

(۲) اگر کوئی ایسی کتاب مرتب بھی کر لی جائے جس میں سنتِ رسول اللہ کا متفق علیہ متن موجود ہو تو اس سے بھی کیا حاصل ہوگا کیونکہ اس کے متن کی تعبیر میں بھی اختلافات ہوں گے۔ لہٰذا ایسی کتاب کی ضرورت نہیں۔

میں ان حضرات سے اتنا دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر تعبیرات کے اختلاف کی وجہ سے متن بیکار ہو جاتا ہے، تو پھر قرآن شریف کے متن کو باقی رکھنے سے بھی کیا فائدہ ہے؟ اور اگر تعبیرات کے اختلاف کے باوجود متن کی ضرورت ہوتی ہے، تو پھر ایسی کتاب کیوں نہیں مرتب کی جاتی جس میں سنتِ رسول اللہ کا متفق علیہ متن موجود ہو ـــ

لیکن اگر

(۱) اختلافِ تعبیرات کی وجہ سے متن بیکار ہو جاتا ہے۔ اور

(۲) اس بنا پر کسی ایسی کتاب کی ضرورت نہیں جس میں سنتِ رسول اللہ کا متفق علیہ متن موجود ہو، تو پھر آئینِ پاکستان کی اس شق پر عمل کیسے ہو سکے گا جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون رائج نہیں ہوگا جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو۔

مجھے امید ہے کہ آپ طلوعِ اسلام میں میرے اس عریضہ کو شائع کر کے میرے سوال کو اربابِ فکر و نظر تک پہنچا دیں گے وہ چاہیں تو اس کا جواب فکر و نظر میں شائع فرما دیں۔ لیکن جواب میرے سوال کا ہونا چاہیئے اور دو ٹوک۔ والسلام"

ــــــــ (٭) ــــــــ

(۳) وحی کی کنہ و ماہیت

ایک مستفسر کا خط:

"آپ نے میرے پہلے خط کے جواب میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب کو کون سی دینی اہمیت حاصل ہے جو اس کا تفصیلی جائزہ لے کر اس پر بحث شروع کر دی جائے"۔ میں غالباً اپنے خط میں اپنا مقصد واضح نہیں کر سکا۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کتاب پر بحث کی جائے

میں صرف یہ جاننا تھا کہ یہ جو سوال اٹھایا گیا ہے کہ وحی کی کنہ و ماہیت کیا ہوتی ہے۔ یہ خدا کی طرف سے کیسے نازل ہوتی ہے۔ نبی کو کس طرح ملتی ہے۔ ان سوالات کی وضاحت کی جائے۔

طلوع اسلام

ایک اصولی بات سمجھ لیجئے۔ حصولِ علم کا ایک ذریعہ فکرِ انسانی (HUMAN INTELLECT) ہے۔ اس کے متعلق ہر شخص علیٰ قدر وسعت جانتا ہے کہ یہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی نوعیت، ماہیت اور کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس لئے ان امور کے متعلق بحث بھی کی جا سکتی ہے۔ اور کسی کے دعویٰ کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس علم کا ایک ذریعہ وحی ہے جس میں انسانی فکر اور کد و کاوش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ وہ علم ہے جسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خدا کی طرف سے اس کے کسی منتخب بندے کو براہ راست ملتا تھا۔ کوئی غیر از نبی اس میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔

اب آپ سوچئے کہ جس علم میں کوئی غیر از نبی شریک تک نہیں ہو سکتا، اس علم کے متعلق غیر از نبی انسانوں کا بحث کرنا کہ اس کی کنہ و حقیقت کیا ہوتی ہے، وہ نبی کو کیسے ملتا تھا، اس میں نبی کی اپنی پوزیشن کیا ہوتی تھی، ان انسانوں کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ غیر از نبی انسانوں کا ان امور کے متعلق گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے مادر زاد اندھے یہ بحث کر رہے ہوں کہ سرخ رنگ کیسا ہوتا ہے؟

یہ ہے ہمارے عزیز! اس مسئلہ میں غیر از نبی انسانوں کی پوزیشن خواہ وہ کتنے ہی بڑے مفکر اور متکلم کیوں نہ ہوں!

خدا کی یہ وحی آخری مرتبہ حضور نبی اکرمؐ کو ملی جسے حضورؐ نے من و عن بغیر کسی قسم کی آمیزش یا تبدیلی کے دوسرے انسانوں تک پہنچا دیا۔ یہ وحی خدا کے الفاظ میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر ہمارا ایمان۔ ہم اس وحی خداوندی کو اپنے علم و عقل و فکر کی رو سے سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ یہ رسول اللہ پر نازل کس طرح ہوتی تھی — نہ ہی کوئی غیر از نبی اسے جان سکتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ ہم یہ ثابت کیسے کر سکتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے، انسان کا نہیں۔ سو اس کے لئے خود اس وحی کا دعویٰ موجود ہے کہ انسانی فکر اس کتاب کی مثل کوئی کتاب تخلیق نہیں کر سکتی۔ اس دعویٰ کو علم و بصیرت، عقل و فکر اور انسانی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ثابت کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ وحی انسانی فکر کی تخلیق نہیں لیکن اس کی پیش کردہ تعلیم کا سمجھنا، سمجھانا اور اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا انسانی فکر کا کام ہے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک اس باب میں قرآن کی رو سے صحیح پوزیشن!

(۰)

۳۔ طلاق کے قرآنی احکام

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے عورت کی بے بسی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا اس سلسلہ میں ہمیں بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں جن اہم امور کا ذکر آیا ہے انہیں ہم متعلقہ مقامات پر سامنے لائیں گے۔ ان میں کے ایک مشترکہ سوال کا جواب اس جگہ دیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں طلاق کے متعلق کیا احکام ہیں۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ نکاح، عاقل، بالغ، مرد اور عورت کے باہمی معاہدہ کا نام ہے جس میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں۔ یعنی یہ دونوں اپنی رضا و رغبت اور پسند سے، ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ مرد کی طرف سے رضامندی کے لئے کہا گیا کہ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳)۔ جو عورتیں تمہیں پسند ہوں تم ان سے شادی کرو۔ اور عورتوں کی رضامندی کے متعلق کہا کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ (۴/۱۹) تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن بیٹھو۔

اس سے واضح ہے کہ مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی میں جب بھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بیوی خاوند کے لئے (مَا طَابَ) نہ رہے۔ یعنی وہ اسے پسند نہ رہے یا عورت کے دل میں مرد کی طرف سے کراہت پیدا ہو جائے تو ان کی ازدواجی زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی کو طلاق کہتے ہیں۔ یعنی نکاح کی قید سے آزاد ہو جانا۔ آپ نے غور فرمایا کہ عورت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ۔ یعنی جب عورت کے دل میں خاوند کی طرف سے کراہت پیدا ہو تو وہ خاوند کے لئے حلال ہی نہیں رہتی۔ اس باب میں خاوند اور بیوی دونوں کی پوزیشن یکساں ہے۔ کسی کو کوئی امتیازی حق حاصل نہیں۔

(۲) چونکہ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ کسی چھوٹی سی بات پر میاں بیوی میں شکر رنجی یا کشیدگی پیدا ہو جائے۔ اور وہ غصہ میں آ کر ازدواجی زندگی منقطع کرنے کی ٹھان لیں۔ اس قسم کی کشیدگی دور نہیں ہو سکتی جب تک کوئی تیسرا فرد درمیان میں نہ پڑے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے ایک مصالحتی کوشش تجویز کی ہے۔ یعنی ایک نمائندہ خاوند کا اور ایک بیوی کا (۴/۳۵) یہ لوگ میاں بیوی میں مصالحت کی کوشش کریں۔ واضح رہے کہ یہ صرف مصالحتی بورڈ ہے۔ انہیں اس کا حق حاصل نہیں کہ یہ میاں بیوی کے علیحدگی کے فیصلہ کو مسترد کر سکیں۔ اگر ان میں مصالحت ہو جائے تو ہو المراد۔ ورنہ سلسلہ مناکحت منقطع ہو جائے گا۔

(۳) اس سلسلہ کے انقطاع (یعنی طلاق) کی صورت میں بعض امور اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نکاح کے وقت عورت کو مہر دیا گیا یا اس کے بعد خاوند نے اسے زیورات یا کوئی جائداد دی۔ ایسی (شاذ) صورتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک عورت ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے کسی مرد سے شادی کر لے اور جب یہ کچھ حاصل کر لے تو پھر اس سے سلسلۂ مناکحت منقطع کر لے۔ ایسے معاملات کے تصفیہ کے لئے عدالت درمیان میں آ جاتی ہے۔ یعنی عدالت کا یہ کام نہیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ طلاق ہونی چاہیئے یا نہیں۔ اس کا کام یہ فیصلہ کرنا ہے کہ طلاق کی صورت میں اگر کسی فریق کو ناحق نقصان پہنچتا ہے تو اسے اس نقصان سے بچایا جائے۔

(۴) مندرجہ بالا مقصد کے لئے اگر عدالت دیکھے کہ مرد سلسلۂ نکاح منقطع کرنا چاہتا ہے تو وہ فیصلہ دیدے گی کہ مرد نے جو کچھ بیوی کو دیا تھا وہ اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتا۔ (۴/۲۰) لیکن اگر عورت بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہو اور یہ چیز وجہ طلاق ہو تو پھر عدالت، مرد کو کچھ دلا سکتی ہے۔ (۲/۲۲۹) اگر یہ صورت نہیں تو مرد کے لئے قطعاً یہ جائز نہیں کہ جو کچھ اس نے عورت کو دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لینے کے لئے عورت کو پابند رکھے۔ یعنی اسے رکھنا بھی نہ چاہے، لیکن اسے تنگ کرے کہ وہ اس سے ان چیزوں میں سے کچھ واپس لے لے جو اسے دی تھیں۔ عدالت اس امر کا بھی فیصلہ کرے گی (۴/۱۹)۔

(۵) اگر عدالت دیکھے کہ عورت، علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے بایں نیت کہ جو کچھ وہ مرد سے لے چکی ہے اسے ہتھیا لے تو وہ اس عورت سے کچھ واپس دلا سکتی ہے۔ (۲/۲۲۹)

(۶) بس یہ ہیں ازدواجی رشتہ کے انقطاع سے متعلق قرآنی احکام۔ ان احکام سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے قطعًا یہ صورت نہیں کہ

(۱) مرد جب جی چاہے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر اس رشتہ کو ختم کر دے اور عورت کو اس کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں۔ (عورت کے طلاق حاصل کرنے کے لئے خلع کا لفظ تک قرآن میں نہیں آیا)۔ رشتۂ نکاح تو (مصالحت کی کوشش کی ناکامی کے بعد) منقطع ہو جائے گا خواہ اسے مرد منقطع کرنا چاہے یا عورت۔ عدالت ان کے اس فیصلہ کے عواقب سے متعلق امور کا فیصلہ کرے گی۔

(۲) نہ ہی قرآن سے یہ ثابت ہے کہ طلاق کا حق صرف مرد کو حاصل ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنا یہ حق عورت کو تفویض کر سکتا ہے۔

(۷) چونکہ سوال صرف طلاق سے متعلق قرآنی احکام کا ہے اس لئے ہم نے طلاق کے بعد انہی میاں بیوی میں دوبارہ نکاح۔ عدت۔ مہر۔ نان نفقہ۔ حضانت (یعنی اولاد کس کی تحویل میں رہے گی) سے متعلق احکام درج نہیں کئے۔ جو حضرات ان احکام کو دیکھنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ پرویز صاحب کی کتاب "قرآنی قوانین" کا مطالعہ فرمالیں۔

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے عورت کی بے بسی کے متعلق جو مراسلہ شائع کیا تھا اس سلسلہ میں ہمارے پاس بہت سے خطوط آئے ہیں۔ نیز طلاق کی فقہی حیثیت اور مروجہ قانونی پوزیشن کے متعلق بھی بہت سی تفاصیل موصول ہوئی ہیں۔ اشاعت حاضرہ میں عدم گنجائش کی وجہ سے ہم انہیں درج نہیں کر سکے۔ اس سوال کو پوری تفصیل سے ہم آئندہ اشاعت میں سامنے لائیں گے۔ ہماری مظلوم بیٹیاں تھوڑا سا اور توقف کریں۔

ضرورت رشتہ

ریٹائرڈ اسسٹنٹ انجینئر کی کنواری ایف۔ اے دختر کے لئے رشتہ درکار ہے۔ تمام تفاصیل پہلے خط میں آنی ضروری ہیں۔

(م م) معرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی گلبرگ لاہور

طلوعِ اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن

امسال طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن، اپنے روایتی وقار و سنجیدگی، اور سادگی و شادابی کے ساتھ

پرویز صاحب کے مکان واقعہ ۲۵/بی گلبرگ (۲) لاہور میں

مورخہ (۱۰) لغایت (۱۳) اکتوبر، بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار منعقد ہوگی۔

کنونشن کے کچھ اجلاس خصوصی ہوں گے جن میں صرف بزمہائے طلوعِ اسلام کے ارکان یا مہمانانِ خصوصی شریک ہوسکیں گے۔ باقی اجلاس کھلے ہوں گے جن میں وہ حضرات بھی شرکت کرسکیں گے جو ان میں پیش کردہ مقالات، خطابات و تقاریر کو سنجیدگی و سکون سے سننا چاہیں۔

کھلے اجلاس کا مشروط پروگرام حسبِ ذیل ہوگا

پہلا اجلاس ــــ (۱۱) اکتوبر، بروز جمعہ۔ بوقت ۲ بجے سہ پہر۔

خطاب پرویز صاحب ــــ جنت کیا ہے؟ ــــ (ایک حقیقت کشا تبصرہ)

دوسرا اجلاس ــــ بروز جمعہ ــــ بعد نماز مغرب

لیکچر ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ــــ عنوان ــــ تخلیقِ کائنات۔ (سائنس اور قرآن کی روشنی میں)

(تشریح بذریعہ میجک لینٹرن)

تیسرا اجلاس ــــ بروز ہفتہ۔ بوقت ۲ بجے سہ پہر

مذاکرہ ــــ جس میں بالعموم طلباء و طالبات حصہ لیں گے۔

عنوان ــــ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر!

چوتھا اجلاس ــــ بروز ہفتہ ــــ بوقت ۸ بجے شب۔

مجلسِ استفسارات ــــ پرویز صاحب آپ کے سوالات کے جوابات قرآن کریم کی روشنی میں دیں گے بشرطیکہ سوال پہلے موصول ہوچکے ہوں۔

پانچواں اجلاس ــــ بروز اتوار ــــ صبح دس بجے۔

مقالہ پرویز صاحب ــــ وہ افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا (فکری و علمی دنیا کے بعض مسلمات کی حقیقت)

ــــ (ان کے علاوہ دیگر تقاریر کا بھی امکان ہے)

واضح رہے کہ طلوعِ اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں کی سی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی نہایت سنجیدہ و پُر وقار علمی محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آدابِ مجلس کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

(میرزا) محمد خلیل ــــ صدر کنونشن کمیٹی طلوعِ اسلام

ادارۂ طلوعِ اسلام کی تازہ پیشکش

منزل بہ منزل

● طلوعِ اسلام نہ کسی سیاسی پارٹی کا نام ہے نہ مذہبی فرقہ کا۔ یہ قرآنی فکر کے عام کرنے کی ایک تنظیمی کوشش ہے۔ اسی کو تحریکِ طلوعِ اسلام کہا جاتا ہے۔

● یہ تحریک کن کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچی ہے' یہ داستان بڑی حقیقت کشا اور بصیرت افروز ہے۔

● اس داستان میں اُن تمام عناصر کا تذکرہ بھی سامنے آجاتا ہے جو مسلمانوں کے قرآن مجید تک آنے کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہے اور آج بھی کھڑے ہیں۔

● قرآنی فکر کی تحریک ان موانعات کو کس طرح دور کرتی اور امت کو کیسے قرآن مجید کے قریب لاتی ہے۔

● اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کے سالانہ اجتماعات نے کیا نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔

● اور ان اجتماعات میں' اس تحریک کے بانی' پرویز صاحب نے اپنے انقلاب آفریں خطابات کے ذریعے قوم کو کیا پیغام دیا ہے۔

منزل بہ منزل

اسی قافلۂ قرآنی کی جادہ پیمائی کی نہایت حسین وسادہ' اور بے حد جاذب و پُرکشش داستان ہے جسے بڑے دلکش انداز میں مرتب اور پیش کیا گیا ہے!

چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب آئندہ کنونشن تک منظرِ عام پر آجائے گی۔

قیمت: چھ روپے فی جلد

ناظم' ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

رفیع اللہ

الاخوان المسلمون اور جماعتِ اسلامی

ماضی قریب میں مختلف اسلامی ممالک میں اسلام کے نام پر جو جماعتیں وجود میں آئی ہیں، ان میں سے دو جماعتوں نے خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں یعنی الاخوان المسلمون اور جماعتِ اسلامی کے بانی قدیم طرز کے دینی مدارس سے فارغ التحصیل نہیں۔ یہ صاحبان نہ کسی دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں نہ کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے یہ علوم اپنے طور پر حاصل کئے ہیں۔ الاخوان المسلمون کی بنیاد قاہرہ یونیورسٹی کے ایک گریجویٹ جناب حسن البنا نے دنیائے عرب کے علمی و ادبی مرکز مصر میں ۱۹۲۸ء میں ڈالی اور جماعتِ اسلامی کا قیام مولانا مودودی صاحب کے ہاتھوں ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں عمل میں لایا گیا۔ اور دارالاسلام پٹھانکوٹ کو اس کا مرکز قرار دیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ مرکز لاہور میں تبدیل کر دیا گیا۔ دونوں جماعتوں نے اپنے قیام کا مقصد یہ بتایا کہ وہ اسلام کے پورے نظامِ حیات کو نافذ کرنے کا عزم لے کر اٹھی ہیں۔ بلکہ انہوں نے یہاں تک دعویٰ کر رکھا ہے کہ صدیوں سے جس اہم کام سے غفلت برتی جا رہی تھی، اس کی تلافی کی وہ کوشش کر رہے ہیں۔

اسلامی نظام کے قیام سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص بھی ایسے دعوے کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ راقم السطور بھی پچھلے پندرہ بیس سال سے ان دونوں جماعتوں کی سرگرمیوں کا بڑے غور سے مطالعہ کرتا رہا ہے۔ اور جس چیز نے مجھے آئندہ سطور لکھنے پر مجبور کیا وہ یہ ہے کہ جہاں ان دونوں جماعتوں کی بعض خصوصیات میں توافق کامل ہے، وہاں اہم ترین۔۔۔ شرعی مسائل میں ان کے درمیان اتنا اختلاف ہے کہ جو چیز ایک کے نزدیک جائز ہے، دوسری کے نزدیک حرام ہے۔۔۔ مثلاً الاخوان المسلمون اسلامی دنیا کو "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح دینے والے ہیں لیکن جماعتِ اسلامی اسے خلافِ اسلام قرار دے کر اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے ممالک میں اپنا اپنا پیش کردہ اسلامی نظامِ حیات قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، تو کیا ایک اسلامی ملک میں ایک چیز شرعی طور پر جائز ہوگی اور وہی چیز دوسرے اسلامی ملک میں حرام؟

الاخوان المسلمون کا تعارف

ہمارے ملک میں الاخوان المسلمون کے تفصیلی تعارف کا سہرا بلاشبہ جماعتِ اسلامی کے سر ہے۔ جماعتِ اسلامی نے عربی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک خصوصی ادارہ

"دارالعروبۃ" قائم کر رکھا ہے۔ اس کے پہلے ناظم مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) نے اخوان کو ہم سے متعارف کرایا اور جماعتِ اسلامی کو عربی دنیا سے۔ چنانچہ بعض اوقات جوشِ ہم آہنگی میں یہاں تک کہہ دیا جاتا رہا ہے کہ چونکہ دونوں جماعتوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی اسلامی نظامِ حیات کا قیام' اس لئے یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہو گا کہ "الاخوان المسلمون" مصر کی جماعتِ اسلامی " ہے۔ اور جماعتِ اسلامی پاکستان کی الاخوان المسلمون۔ یہی وجہ ہے کہ جماعتِ اسلامی والے اخوان کے لٹریچر کا ایک ایک لفظ اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ اور اپنا لٹریچر عربی میں ترجمہ کر کے انہیں چھاپ رہے ہیں۔

دونوں جماعتوں کا ابتدائی کام

دونوں جماعتوں نے اپنی ابتداء میں جمود پسند علماء کے طرزِ عمل پر کڑی تنقید کی کہ انہوں نے اسلام کو پوجا پاٹ کا مذہب بنا کر رکھ دیا ہے حالانکہ یہ ایک مکمل نظامِ زندگی تھا۔

علماء پر تنقید

علماء پر تنقید جماعتِ اسلامی نے بھی کی ہے اور الاخوان المسلمون نے بھی۔ اور اس باب میں دونوں کا انداز ملتا جلتا ہے۔ یہ تنقیدیں دونوں جماعتوں کے لٹریچر میں سینکڑوں جگہوں پر بکھری پڑی ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لئے ہم ان کی صرف ایک جھلک ہی دکھا سکیں گے۔ پہلے الاخوان المسلمون کی تنقید سنئے۔ ان کے ایک مشہور اہلِ علم الشیخ محمد الغزالی' اپنی کتاب "مِنْ هُنَا نَعْلَمْ" (ہم یہاں سے جانتے ہیں) میں مصر کی مشہور دینی جماعتوں (الجمعیات الدینیہ) پر اس طرح تبصرہ فرماتے ہیں۔

> ایک انجمن ہے جو روزہ نماز پر قانع ہے۔ اس کے کارکنوں کو معاشرتی معاملات پر توجہ دلایئے تو جواب ملے گا "ہم سیاست میں دخل نہیں دیتے"۔ دین کے اس فہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے فلسطین ہاتھ سے نکل گیا اور ان کے ہاتھوں میں جنبش تک نہ ہوئی۔ ایک دوسری شاندار انجمن ہے جو قبروں کی پرستش اور تقلیدِ محض کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ اور محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات پھیلانے میں سرگرم ہے۔ جب ان سے پوچھئے کہ زندوں کی عبادت (عبادت الاحیاء) اور خود عبدالوہاب کے وطن میں طواغیت (مراد سعودی حکومت) کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا کیسا ہے تو لبوں پر مہرِ سکوت لگ جاتی ہے[1]

یہ کتاب ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سے پورے تیس صفحے جمود پرست علماء پر تنقید کے لئے وقف ہیں۔

اب دیکھئے کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے ایسے علماء کی کیسی خبر لی گئی ہے۔[2]

> "مگر عام طور پر علماءِ دین جن مشاغل میں مشغول رہے وہ یہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر مناظرہ بازیاں کیں' چھوٹے مسائل کو بڑے مسائل بنایا اور بڑے مسائل کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اختلاف کو مستقل فرقوں کی بنیاد بنایا اور فرقہ بندی کو جھگڑوں اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنایا۔ معقولات کے پڑھنے پڑھانے میں عمریں گزار دیں اور قرآن و حدیث سے نہ خود ذوق رکھا نہ لوگوں میں پیدا کیا۔ فقہ میں اگر کوئی دلچسپی لی تو موشگافیوں اور جزئیات کی بحثوں کی حد تک لی۔ تفقہ فی الدین پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ

---

[1] "مِنْ هُنَا نَعْلَمْ" از شیخ محمد الغزالی صفحہ ۷۳-۷۴۔

[2] ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۲۱۳/۵۹

نہ کی۔ ان کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے لوگوں کی نگاہیں خود دین بن کر رہ گئیں، وہ دین وجہاں بین نہ بن سکیں۔ آج یہ پوری میراث جھگڑوں، اور مناظروں اور فرقہ بندیوں اور روز افزوں فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل کے ساتھ ہمارے حصہ میں آئی ہے۔

قارئین چاہیں تو اس قسم کی سینکڑوں عبارتیں جماعت اسلامی کے لٹریچر سے مہیا ہو سکتی ہیں۔

دین وسیاست کی وحدت

اسلامی نظام حیات کے قیام کے مطالبہ کے دوران جو نعرہ بار بار دہرایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دین وسیاست ایک ہی وحدت ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بحث دونوں جماعتوں کے نزدیک اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر ان حضرات کی طرف سے اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کی تفصیلات میں جانا تحصیل حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ہاں بچہ بچہ کی زبان پر علامہ اقبالؒ کا یہ مصرعہ ہے۔ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

الاخوان المسلمون والے عام طور پر اس سلسلے میں مہاتما گاندھی کے درج ذیل قول کو نقل کرتے رہے ہیں۔

اذا انفصلت السیاسة عن الدین فقد معناها ـــ غاندی الذی کان یقول انه لا یؤمن بدین۔[1]

جب سیاست دین سے جدا ہو جاتی ہے تو اپنا مفہوم کھو دیتی ہے ـــ گاندھی ـــ جو کہتا تھا کہ اس کا کسی دین پر ایمان نہیں۔

طریقہ رکنیت اور ممبران کی تعداد

دونوں جماعتوں کے طریقہ رکنیت میں بڑا گہرا فرق نظر آتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی کے ارکان کی تعداد ۵۰۴ تھی۔ اور پاکستان کی اُس وقت کی آبادی (تقریباً) دس کروڑ۔ میں اگر یہ تناسب دیکھا جائے تو ڈیڑھ لاکھ کی آبادی پر ایک رکن بنتا ہے۔ اس کے برعکس مصر کی دو کروڑ کی آبادی میں اس وقت الاخوان المسلمون کے ممبروں کی تعداد پورے بیس لاکھ تھی یعنی دس افراد کے پیچھے ایک رکن۔ دونوں جماعتوں کے ارکان میں یہ ایک اور پندرہ ہزار کی نسبت کی بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جماعت اسلامی کا معیار رکنیت بڑا سخت ہے جبکہ الاخوان المسلمون کا فارم پُر کر دینے والا ہر فرد اس کا ممبر تصور ہوتا تھا جیسا کہ عام سیاسی جماعتوں میں ہوا کرتا ہے۔ مصر کے موجودہ صدر جمال عبدالناصر کسی زمانے میں الاخوان المسلمون کے باضابطہ رکن تھے۔[2]

ان کے بارے میں علماء کا رویہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ان دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے قدامت پسند علماء کو خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا کہ وہ بیکار مشغلوں میں پڑ کر اسلامی نظام حیات کے قیام سے غافل ہو چکے تھے۔ دوسری طرف جمہور علماء نے ان جماعتوں کو کس نگاہ سے دیکھا اس کی داستان بھی

---

[1] المسلمون، نمبر ۳۔ جنوری ۱۹۵۲ء صفحہ ۷۹

[2] ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۲۱۴/۹۱

خود انہی کی زبانی سنیئے۔ جماعتِ اسلامی پر جو فتوے لگائے گئے تھے ان کی گونج کافی عرصہ تک سنائی دیتی رہی تھی۔ امیر جماعتِ اسلامی نے ایک موقع پر ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا۔

"لیکن یہاں تو پاکستان سے ہندوستان تک ہر طرف فتووں، پمفلٹوں، اشتہاروں اور مضامین کی فصل اُگ رہی ہے جس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، فرنگیت زدہ ملحدین، قادیانی، منکرینِ حدیث، اہلِ حدیث، بریلوی اور دیوبندی سب ہی اپنے اپنے شگوفے چھوڑ رہے ہیں اور آئے دن نئے نئے شگوفے چھوٹتے رہتے ہیں۔ اس فصل کو آخر کون کاٹ سکتا ہے اور کہاں تک کاٹ سکتا ہے۔ مجھے اگر دنیا میں اور کوئی کام نہ کرنا ہو تو میں اسے کاٹنے میں اپنی عمر کھپاؤں۔ اور جماعتِ اسلامی اگر اپنے مقصد اور اپنے کام سے دستبردار ہو جائے تو اس پر اپنی محنت ضائع کرے۔ ہمارے مخالفین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس حماقت میں مبتلا ہوں اور اس جھاڑ جھنکار سے الجھ جائیں تاکہ فساق و فجار کی قیادت کو اپنا کام کرنے کے لئے صاف راستہ مل جائے۔ لیکن ہم نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ شیطان کی فصل ہے، وہی اسے کاٹے گا۔ خود نہ کاٹے گا تو سنۃ اللہ یہی ہے کہ بالآخر اس کو خود ہی اسے کاٹنا پڑیگا"[۳۳]

جسے "شیطان کی فصل" قرار دیا جا رہا ہے اس فصل کے ایک کھیت کی جھلک قارئین بھی دیکھ لیں۔ یہ کھیت مولانا حسین احمد مدنی دارالعلوم دیوبند کے فتوے پر مشتمل ہے، فرماتے ہیں۔

"ان خبیثوں سے گفتگو اور مناظرہ کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کی اور ہماری ہدایت فرمائے۔ آمین!"[۳۴]

الاخوان المسلمون پر کفر کے فتوے

دارالعروبۃ کے اس وقت کے ناظم مولانا مسعود عالم ندوی نے اس راز سے پردہ اٹھایا تھا کہ جماعتِ اسلامی کی طرح الاخوان المسلمون پر بھی کفر کے فتوے لگ رہے ہیں[۳۵]۔ اور حد تو یہ ہے کہ وہ علمائے دین جو خود اس جماعت کی طرح اسلامی نظامِ حیات کے لئے کوشاں ہیں، انہوں نے بھی اس جماعت پر کفر کا فتوےٰ صادر کر دیا۔ مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) نے اس بارے میں کہا تھا۔

"مصر کے سب سے بڑے سلفی عالم اور محقق شیخ احمد محمد شاکر (جن کی تحریریں نظامِ اسلامی کی حمایت میں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں) نے گزشتہ دورِ ابتلا میں حد ہی کر دی۔ یعنی الاخوان المسلمون کے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ العیاذ باللہ"[۳۶]

یہ دورِ ابتلا وہ تھا جب کہ نہر سویز کے انخلاء کے مسئلہ پر حکومت اور اخوان کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی کچھ تفصیلات آگے آئینگی۔

---

[۳۳] ترجمان القرآن۔ مارچ ۔ مئی ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۲۱/۱۹۴

[۳۴] ایضاً۔ جون ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۱۰۵/۱۸۳ ، ۱۰۶/۱۸۴۔ [۳۵] ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۲۴۴/۱۲

[۳۶] ترجمان القرآن لاہور۔ بابت ستمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۴۹/۱۰۹

اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت

دونوں جماعتوں کا موقف یہ تھا کہ چاہے مختلف ممالک میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں لیکن صدیوں سے اسلامی نظام کے قیام سے غفلت ہی برتی جاتی رہی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی یہ حکومتیں ان کے نزدیک اسلامی حکومت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ خود پاکستان کے قیام سے پہلے اور قیام کے کچھ عرصہ بعد تک جماعتِ اسلامی کا یہی نقطۂ نظر تھا۔ ان کے اس نقطۂ نظر کی سنگینی کا اس وقت تک اندازہ نہیں ہو سکے گا جب تک ان کے اپنے الفاظ سامنے نہ آجائیں۔ قرار دادِ مقاصد کے پاس ہونے سے پہلے جماعتِ اسلامی کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کی شرعی حیثیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ ان کے اس اعلان سے لگائیے جو انہوں نے قرار دادِ مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد جاری کیا تھا۔

> جس تاریخ کو اس نوزائیدہ مملکت کی آئینی زبان سے یہ شہادت ادا ہوئی اسی روز جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے اسے ایک اسلامی مملکت ہونے کو تسلیم کر لیا اور ٹھیک ۴۲ روز بعد پوری آئینی پوزیشن کا جائزہ لے کر یہ اعلان کیا کہ اب اس ریاست کی شرعی حیثیت سابق غیر مسلم ریاست سے بالکل مختلف ہو چکی ہے۔ اب اس کی ملازمت جائز ہے۔ اس کی عدالتوں میں جانا حلال ہے۔ ایسا ایک باقاعدہ اسلامی مملکت بن جانے کے بعد یہ دارالکفر نہیں رہی جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہمارا کام ہو بلکہ ہمارا اپنا دار بن گئی جسے بنانا، سنوارنا اور ترقی دینا ہمارا کام ہو گیا۔[10]

ان خط کشیدہ الفاظ پر ذرا ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے۔ دوسرے الفاظ میں قرار دادِ مقاصد سے پہلے اس مملکت کی ملازمت کرنی حرام تھی، اور یہ دشمن کا گھر تھی۔[9] اندازہ لگائیے کہ اس دوران میں اگر کوئی شخص اس مملکت کے ملازم کی حیثیت سے ملک کے دفاع کی راہ میں اپنی جان تک قربان کر چکا تھا، تو ان کے نزدیک اس کی شرعی حیثیت کیا تھی؟

الاخوان المسلمون کا مسلک

تاہم الاخوان المسلمون کا مسلک ان سے جداگانہ تھا۔ مصر میں جب نہر سویز سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے جدوجہد کی گئی تو وہاں ابھی تک کوئی قرار دادِ مقاصد پاس نہیں ہوئی تھی۔ فوجی انقلاب کے ذریعے شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹا جا چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ انگریزوں کے انخلا کی لڑائی میں جان قربان کرنے والوں کو نہ صرف شہید قرار دیتے تھے بلکہ اپنے ترجمان "المسلمون" میں ان کے نام شائع کر کے ان پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک شمارے کی جھلک آپ بھی دیکھیں۔

> كان في طليعة شهداء القتال هذا الشهر الاخوة الاعزاء احمد المنيي وعمر شاهين وعادل غانم من شباب الجامعة ـــــ سلام عليكم ايها الاحبة مع النبيين والصديقين والشهداء والصالحين والى لقاء عزيز في جنة الخلد۔[11]

---

[9] یعنی دشمن کا گھر۔ [10] ماہنامہ ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۶۸-۶۹۔

[11] "المسلمون" قاہرہ جنوری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۱۰۳

ہز سویز کی چپقلش میں اس مہینے کے شہید ہونے والوں میں عزیز بھائی احمد المنیی اور عمر شاہین اور عادل غانم جو یونیورسٹی کے طالب علم تھے، سرفہرست ہیں۔ اے دوستو! تم پر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں، اور صالحین کے ساتھ سلام ہو۔ جنت الخلد میں پیاری ملاقات۔

دیکھئے، ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے کسی ملک کی سیاست پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔

سرکاری ملازمین اور سیاست

سرکاری ملازمین کو سیاست میں ملوث کرنے کے بارے میں الاخوان المسلمون کا مسلک بڑا واضح تھا۔ ان کی طرف سے بڑے فخر سے یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ فوج، پولیس اور حکومت میں بہت سے سرکاری ملازمین ہمارے ساتھ ہیں اور ان میں ہمارے باقاعدہ حلقے قائم ہیں۔ بلکہ ان کا دعویٰ تو یہاں تک تھا۔

"فوجی انقلاب کے علمبرداروں اور الاخوان المسلمون کے مابین ابتداءً فضا تعاون واشتراک کی تھی۔ شروع میں انقلابیوں نے جو اقدامات بھی کئے ہیں، وہ فوج اور پولیس کے اُن افسران کے بل پر کئے ہیں جو اخوان سے تعلق رکھتے تھے۔ اخوان کے جو حلقے اس وقت فوج میں موجود تھے ان کے اجتماعات میں جمال عبد الناصر، عبد اللطیف بغدادی وغیرہم شریک ہوا کرتے تھے۔" [۱۲]

فوجی انقلاب کے بعد جمال عبد الناصر نے الاخوان المسلمون کو نوٹس دیا کہ وہ فوج اور پولیس کو سیاست میں ملوث نہ کرے اور ان کے جو حلقے فوج اور پولیس میں قائم ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ سوچئے کہ دنیا کا کوئی معقول انسان اس پر اعتراض کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی حکومت بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ملک کی کوئی سیاسی جماعت، خلص طور پر جبکہ وہ حزب اختلاف ہو، فوج، پولیس یا دوسرے سرکاری ملازمین کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرے۔ خود ملازمین کے لئے ملازمت کی شرائط کی رُو سے سیاست میں حصہ لینا خلاف قانون ہے۔ لیکن اخوان نے اس مطالبہ کا جواب گومگو کی پالیسی سے دیا اور وہ اپنے حلقے ختم کرنے پر رضامند نہ ہوئی [۱۳]

حکومت کے پاس اس کا آسان علاج یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے ملازمین کو مختلف مقامات پر تبدیل کر دے۔ اخوان کے ساتھ متعلقہ سرکاری ملازمین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اور جن سرکاری ملازمین نے الاخوان المسلمون سے اپنا تعلق ختم کرنے سے انکار کر دیا، انہیں ملازمت سے معزول کر دیا گیا اور آئندہ سے ملٹری اور پولیس کالجوں میں احتیاط برتی جانے لگی کہ اس قسم کے سیاسی لوگ ان اداروں میں راہ نہ پا سکیں۔ [۱۴]

ترجمان القرآن میں اخوان سے متعلقہ سرکاری ملازمین کے ساتھ حکومت کے اس سلوک کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد یہ گلہ کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ یہ زیادتی نہیں بلکہ سخت ظلم ہے۔ [۱۵] حالانکہ صدر ناصر نے یہ اقدامات مناسب نوٹس دینے کے بعد کئے تھے۔

جماعت اسلامی کا عجیب و غریب مسلک

اس سلسلے میں جماعت اسلامی کا مسلک عجیب و غریب ہے۔ ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۴۹ء و جنوری ۱۹۵۰ء

---

[۱۲] ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۰ء صفحہ ۵۰۔ [۱۳] ایضاً صفحہ ۵۱-۵۵ [۱۴] [۱۵] ایضاً۔

صفحہ ۱۷۱ میں ان سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا سرکاری ملازمین جو آپ کے ساتھ ہیں وہ انتخابات میں عملاً حصہ لے سکتے ہیں۔ اگر آپ ان کے لئے یہ حق تسلیم کرتے ہیں تو دوسری جماعتوں سے تعلق رکھنے والوں کے لئے بھی یہ حق تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے جو جواب دیا گیا تھا وہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ یعنی یہ کہ اسلامی پاکیزہ سیاست میں ان کے لئے حصہ لینا واجب ہے لیکن غیر اسلامی سیاسی پارٹیوں میں حصہ لینا جائز نہیں ہے۔ انہوں نے اسلام کی پاکیزہ سیاست جس کو دینی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں' کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ کہ بس صرف اس سیاست کے لئے جماعتِ اسلامی ہر مسلمان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو پورے جذبے کے ساتھ استعمال کریں۔ چنانچہ اس کا یہ مطالبہ ملازمین سے بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی عام مسلمان سے ہے۔ بلکہ ملازمین سے خاص طور پر کیونکہ شرعاً وہ پوری مملکت کے شہریوں کی تعلیم و تنظیم کے ذمہ دار ہیں[۱۶]

اس جواب سے اشارۃً یہ بات سامنے آجاتی تھی کہ چونکہ جماعتِ اسلامی اس قسم کی پاکیزہ اسلامی سیاست کے لئے انتخاب لڑ رہی تھی' اس لئے اس سے تعلق رکھنے والے ملازمین اس سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن وہ غیر اسلامی سیاسی پارٹیوں کو یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس بارے ان کا فیصلہ یہ تھا۔

"یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملازم حکومت اپنے اپنے درجے کے لحاظ سے ایک خاص حد تک اثر رکھتا ہے۔ اور اگر وہ اس اثر کو انتخابات میں استعمال کرے تو بہت سے شہریوں کی آزادیٔ رائے کو سلب یا کمزور کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک عہدہ دار یا ملازم کا یہ کہنا کہ میں فلاں کو ووٹ دوں گا' بسا اوقات عوام کی آزادیٔ رائے کو کمزور کر دیتا ہے[۱۷]"

اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے حکومت پر قبضہ

دونوں جماعتوں کا مسلک یہ ہے کہ اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے لئے ضروری ہے' کہ حکومت صالح افراد کے ہاتھوں میں ہو۔ "صالح افراد" سے ان کا جو مفہوم ہے قارئین اسے جانتے ہوں گے۔ یعنی ان کی اپنی جماعت کے افراد۔ تاہم حکومت پر قبضہ کرنے کے بارے میں دونوں کے طرزِ عمل میں بنیادی اختلاف ہے۔ جماعتِ اسلامی کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے قانونی ذرائع اختیار کرے گی۔ یعنی انتخابات کے ذریعے فاسد قیادت کو صالح قیادت سے بدلے گی۔عہ اس کے برعکس الاخوان المسلمون اس مقصد کے لئے نہ صرف تشدد کی قائل ہے بلکہ جب بھی اسے اس قسم کا کوئی موقع ملتا ہے اسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ حالانکہ ہر برسرِ اقتدار حکومت کسی سیاسی پارٹی کے تشدد پر عمل کرنے کو بغاوت کا نام دیتی ہے۔

مزے کی بات ہے کہ جماعتِ اسلامی اپنے مسلک کے برعکس الاخوان المسلمون کے اس طرزِ عمل کو بنظرِ تحسین دیکھتی رہی ہے بلکہ اس کے رسائل و جرائد میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات بڑے فخر سے دہرائی گئی ہے کہ شاہ فاروق کے خلاف جب فوج انقلاب کی تیاریوں میں مشغول تھی تو اخوان والے اس کی روحِ رواں تھے اور وہ ہر طرح سے فوجی افسران

---

۱۶ ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۶۷ - ۱۷ ایضاً صفحہ ۱۶۵

عہ جماعتِ اسلامی نے اس مسلک کا اعلان اب کیا ہے۔ اس سے پہلے ان کے ہاں اس قسم کی تحریریں موجود ہیں کہ اقتدار پر قبضہ قوت کے زور سے کیا جا سکتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

کا ساتھ دیئے رہے تھے۔ مثلاً اس انقلاب کی ابتدا کے طور پر قاہرہ پر قبضہ کر لینے کی تیاریوں کی کچھ خبر شاہ فاروق کے حامی فوجیوں کو بھی ہو گئی تھی تو شاہ نے نوٹا اسلحہ کی تلاشی کے احکام صادر کر دیئے تھے۔ اب اگر یہ اسلحہ پکڑ لیا جاتا تو اس وقت عالم عرب کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن اس سلسلے میں الاخوان المسلمون نے کیا کردار ادا کیا وہ انہی کی زبانی سنیئے۔

"فوجی افسروں نے اس موقع پر اخوان سے مدد چاہی تاکہ افسران کی رہائش گاہوں میں جمع شدہ ہتھیاروں کو کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔ اس وقت قاہرہ کی حالت یہ تھی کہ چاروں طرف فاروق کے حامی سپاہی پھیلے ہوتے تھے۔ اکثر مقامات پر گولی چل رہی تھی۔ سڑکوں پر ہتھیار اور اسلحہ کا ذخیرہ لے کر نقل و حرکت کرنا تو کجا نہتے آدمی کا چلنا پھرنا بھی موت کے منہ میں جانے کے ہم معنی تھا۔ اس آگ اور خون کی بارش میں اخوان اپنی کاڑیاں لے کر فوجی حکام کے گھروں تک پہنچے اور وہاں سے سامان جنگ لاد لاد کر حسن عشماوی (خلف الاستاد محمد حسن عشماوی پاشا) کے ہاں جمع کرتے رہے۔ جمال عبدالناصر کی اپنی ہدایات اور نگرانی کے تحت یہ ذخیرہ عشماوی صاحب کی زمین کے ایک دور افتادہ حصے میں چھپا دیا گیا۔"[۲۴]

یہ مسلح انقلاب ایک ایسی حکومت کے خلاف برپا کیا جا رہا تھا جس کے حامی سپاہی قاہرہ جیسے تیس لاکھ آبادی کے شہر کے چپہ چپہ پر موجود تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام کے قیام کے لئے اس طرح کا باغیانہ اقدام شرعی حیثیت سے جائز ہو سکتا ہے؟

جماعتِ اسلامی والوں نے اپنے رسائل و جرائد میں اخوان کے اس واقعہ کو نقل کیا تھا لیکن کہیں بھی اس کے ساتھ اختلافی نوٹ نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ جہاں انہیں اخوان سے کسی قسم کا اختلاف ہوتا ہے وہ ضرور وہاں اختلافی نوٹ دیا کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے الاخوان المسلمون کے نظریہ "اسلامی سوشلزم" کی کبھی تائید نہیں کی، بلکہ جہاں بھی اس کا بیان آیا ہے نیچے اپنا اختلاف دیا ہے۔

ناجائز اسلحہ کی برآمد

یہ (مصر کے) ۵۲-۱۹۵۱ء کے واقعات تھے۔ یہ فوجی انقلاب بڑی حد تک کامیاب رہا۔ اس کے کرتا دھرتا وہی جمال عبدالناصر تھے جن کی ہدایات اور نگرانی میں اسلحہ کا مذکورہ بالا بھاری ذخیرہ جناب صالح العشماوی کی زمین کے دور دراز حصے میں چھپا دیا گیا تھا۔ کیا انقلاب کے بعد صدر جمال عبدالناصر اسلحہ کے اتنے بڑے ذخیرے سے لاپرواہ ہو سکتے تھے یا صرفِ نظر کر سکتے تھے؟ بالخصوص اس وقت جبکہ مصر کیا ساری دنیائے عرب میں اسلحہ کی افسوسناک حد تک کمی تھی اور دوسرے ممالک سے سخت سے سخت شرائط کے تحت بھی اس کا حصول مشکل تھا۔ ایسے فوجی انقلابوں کے بعد تو حکومتیں لائسنس یافتہ معمولی اسلحہ کو بھی عارضی طور پر اکٹھا کر لیا کرتی ہیں۔ چہ جائیکہ اسلحہ اور بارود کی اتنی بھاری مقدار کو بھلا دیا جائے۔

اس وضاحت کی ضرورت نہیں اس لئے ہوئی کہ فوجی انقلاب سے کوئی تقریباً دو سال بعد نہر سویز کے معاملے میں جب حکومت اور الاخوان المسلمون کی چپقلش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تو فوج نے چھاپہ مار کر اخوان کے ایک مرکز سے اسلحہ کی ایک بڑی بھاری مقدار برآمد کر لی۔ چنانچہ اخوان کے خلاف جو مقدمہ چلایا گیا تھا اس میں ایک فردِ جرم اسلحہ کا یہ

---

[۲۴] ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۲۹۶/۵۱

ناجائز ذخیرہ بھی تھا۔

الاخوان المسلمون کی طرف سے اسلحہ کے اس بھاری ذخیرہ کے متعلق یہ صفائی پیش کی گئی کہ یہ تو وہی اسلحہ ہے جو انقلاب سے قبل صدر جمال عبدالناصر نے فاروق کی نظروں سے بچانے کے لئے حسن العشماوی کے ہاں چھپایا تھا[۱۹]۔

اس معاملہ میں اگر الاخوان المسلمون کی طرف سے پیش کردہ صفائی کو تسلیم بھی کر لیا جائے (جس میں شک کی بڑی گنجائش ہے) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کے لئے یہ کسی صورت میں بھی جائز تھا کہ وہ اتنا عرصہ اسلحہ کا اتنا بڑا ذخیرہ ناجائز طور پر اپنے تصرف میں رکھتے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنی مخالف سیاسی جماعت کو اسلحہ کا اتنا بڑا ناجائز ذخیرہ تو کجا جائز ذخیرہ رکھنے کی بھی کبھی اجازت نہ دے گی۔

اخوانی طلبہ

وہ واقعہ جس کے دوسرے دن الاخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا وہ ۱۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو قاہرہ یونیورسٹی میں ایک دردناک خونی ہنگامہ تھا۔ الاخوان المسلمون سے ہمدردی کی وجہ سے جماعت اسلامی کی طرف سے ان کی مدافعت کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں پر اکثر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو تاریخی حقائق تک کو جھٹلا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہیں کہیں ہم مختصر الفاظ میں اپنی طرف سے بھی وضاحت کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ چونکہ نازک ہے اس لئے ہم اپنی طرف سے ایک لفظ کا اضافہ بھی نہیں کریں گے بلکہ جماعت اسلامی کے دارالعروبہ کے اس وقت کے ناظم مولانا مسعود عالم ندوی کی زبانی اس کی تفصیلات پیش کریں گے۔ الاخوان المسلمون سے تعلق کی وجہ سے انہوں نے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا اس واقعہ کو بے ضرر اور حب تر ثابت کرنے کی کوشش کی ملاحظہ فرمائیے۔

"۱۲ جنوری کو اخوانی طلبہ یونیورسٹی کے میدان میں یوم شہداء منا رہے تھے[۲۰] کہ اچانک ایک جیپ آئی جس پر کئی مسلح آدمی سوار تھے اور وہ طلبہ میں سے یقیناً نہیں تھے۔ آتے ہی انہوں نے اللہ اکبر اور العزۃ لمصر کا نعرہ لگانا شروع کیا۔ اخوانی طلبہ نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر جیپ والوں نے ریوالور سے کام لینا شروع کر دیا۔ مصر گاندھی جی کا دیس[۲۱] تو ہے نہیں۔ ادھر سے بھی ترکی بہ ترکی جواب ملا۔ اور جیپ والے ایک طرح سے گھیرے میں آ گئے[۲۲]"

دیکھئے کس طرح دبے دبے الفاظ میں تشدد کی حمایت کی جا رہی ہے!

اخوان کی طرفداری

ہم نے اوپر کہا ہے کہ جماعت اسلامی والے الاخوان المسلمون کی طرف داری میں کثر اوقات حق کا دامن تک چھوڑ دیتے ہیں۔ آگے چلنے سے پہلے اس کی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

جمہوریہ متحدہ عرب کا دستور

جماعت اسلامی کے دارالعروبہ کے موجودہ ناظم اس سلسلے میں فرماتے ہیں۔

---

[۱۹] ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۴ء ۔ صفحہ ۴۷

[۲۰] یعنی وہ لوگ جو انگریزوں کو نہر سویز سے نکالنے کے لئے خفیہ حملوں میں شہید ہو گئے تھے۔ اس معاملہ میں حکومت اور اخوان کی چپقلش کو سامنے رکھا جائے تو ہر معقول آدمی اس جلسہ کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔

[۲۱] کتنی خلاف حقیقت مثال ہے۔   [۲۲] ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۶۲

مصری انقلاب کو آج چودہ سال ہونے کو ہیں مگر آج تک وہاں مستقل دستور نافذ نہیں کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایک عارضی دستور وضع کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں اس دستور کو بھی فارغ خطی دے دی گئی۔ کیا کسی اور سوشلسٹ یا غیر سوشلسٹ ملک کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جس نے چودہ سال بے دستوری کی حالت میں گزارے ہوں اور ابھی اسے کوئی خبر نہ ہو کہ کتنی مدت اور وہ اسی حالت میں رہے گا[۴۳]

حالانکہ اس اہم ترین خبر کے متعلق ان کی قیمتی معلومات میں سے کوئی ایک جز بھی صحیح نہیں ہے۔ مصر کا عارضی آئین ۱۹۵۸ء میں بنایا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں اس عارضی آئین کو فارغ خطی نہیں دی گئی تھی بلکہ کچھ مزید آئینی اصلاحات کی گئی تھیں اور ۱۹۶۴ء میں ایک مکمل جمہوری دستور نافذ کر دیا گیا تھا۔ اس دستور کے آرٹیکل نمبر ۱۶۹ میں پچھلے دستوری اقدامات کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔

"مادۃ ۱۶۹۔ ینتھی العمل بالدستور الموقت الصادر فی ۱۳ شعبان سنة ۱۳۷۷ھ الموافق ۵ مارس سنة ۱۹۵۸ء و بالاعلان الدستوری بشان التنظیم السیاسی لسلطات الدولة العلیا الصادر فی ۲۸ ربیع الآخرة سنة ۱۳۸۲ھ الموافق ۲۷ ستمبر سنة ۱۹۶۲ء"

آرٹیکل ۱۶۹۔ ۱۳ شعبان ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ مارچ ۱۹۵۸ء کو جو عبوری دستور نافذ کیا گیا تھا وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ سیاسی اداروں کی تشکیل کی غرض سے ۲۸ ربیع الآخر ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۶۲ء کو جو آئینی اعلان جاری ہوا تھا وہ بھی منسوخ تصور کیا جائے گا۔

ان کی یہ غلط معلومات تو اس اہم واقعے کے بارے میں ہیں جس کی حکومت مصر کی طرف سے سب سے زیادہ پبلسٹی کی گئی۔ ۱۹۶۴ء والے دستور کو دنیا کی تمام زبانوں میں چھپوا کر مفت تقسیم کیا گیا تھا۔ اس کے عربی، اردو اور انگریزی ایڈیشن تو راقم الحروف کے پاس بھی موجود ہیں۔

ایک اور اہم واقعہ اور ان کی تضاد بیانی

نہر سویز کے انخلاء کے معاملے میں صدر جمال عبدالناصر نے الاخوان المسلمون پر ایک یہ الزام بھی لگایا تھا کہ وہ انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیلات اگلے عنوان میں آئیں گی۔ دار العروبہ کے اس وقت کے ناظم مولانا مسعود عالم ندوی جن کے متعلق جماعت اسلامی کی طرف سے یہ دعوےٰ کیا جاتا تھا کہ وہ عرب دنیا کے بارے سب سے زیادہ معلومات رکھنے والے ہیں۔ الاخوان المسلمون کی طرف سے یہ صفائی پیش کرتے ہیں۔

"اب سوال رہ جاتا ہے کہ الاخوان المسلمون خلاف قانون کیوں قرار دی گئی اور اس پر یہ سازش اور یہ منصوبہ کس لئے؟ میری نگاہ میں اس کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ ایک وجہ اور فوری وجہ تو یہ ہے کہ انگریزوں سے دب کر صلح کرنے اور امریکہ سے منہ مانگی امداد لینے کی راہ میں الاخوان المسلمون حائل تھی۔ یہ لمبی چوڑی باتیں کرنے والے فوجی سورما انگریزوں اور امریکیوں کے سامنے جس طرح سر تسلیم خم کر رہے ہیں اس کا حال عام لوگوں کو نہیں معلوم۔ لیکن آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا۔ درحقیقت اخوان پر الزام کا ساز باز رکھنے والے خود ساز باز کے لئے راستہ

---

۴۳ چراغ راہ، سوشلزم نمبر جلد ۱ صفحہ ۲۴۷

ہموار کر رہے ہیں۔[۵۹]

بعد کے واقعات نے عرب دنیا کے سب سے باخبر فاضل کی اس بات کو جھٹلا دیا تو جماعتِ اسلامی نے جھٹ پہلے الزام کے بالکل اُلٹ ایک دوسرا الزام لگا دیا کہ وہ روس کے حاشیہ بردار ہو گئے ہیں۔ اس کی تفصیل دار العروبہ کے موجودہ ناظم کی زبانی سنیئے۔

"۱۹۵۲ء میں جب مصر میں نجیب کے ہاتھوں فوجی انقلاب برپا ہوا اور ۱۹۵۴ء میں یہ انقلاب جمال عبدالناصر کی جھولی میں آگرا، اور نجیب کے بجائے جمال عبدالناصر مصر کا نجات دہندہ بن کر اٹھا تو روس نے بلاتاخیر مصر سے فوجی اور سیاسی روابط کے قیام کی داغ بیل ڈال دی۔ روس کی سیاست خارجہ کا یہ دوسرا اہم باب ہے۔ پہلا اہم باب وہ ہے جب روس نے فوجی کارروائی سے مشرقی یورپ کی ریاستوں کو اپنے اندر شامل کیا تھا۔ اور دوسرا اہم باب یہ ہے کہ اس نے مشرقِ وسطےٰ کی ایک فوجی حکومت کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کیا۔"[۶۰]

دیکھیے کس طرح ایک دوسرے کے متضاد اور بالکل الٹ حقائق کو اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ خیال رہے کہ انہی لوگوں کی اس قسم کی تحریریں ہماری آئندہ کی دینی تاریخ کے لئے مستند ترین مواد ہوگا۔

دشمن یا غیر ممالک سے ملکی معاملات طے کرنا

آج تو بچہ بچہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ کسی ملکی معاملہ کو طے کرنے کے لئے کسی دشمن یا غیر ملک سے گفت و شنید یا فیصلہ کرنے کی مجاز صرف حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ مختلف پارٹیوں کو حکومت کے اس قسم کے فیصلوں سے سخت سے سخت اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کرے گی کہ کوئی سیاسی پارٹی کسی غیر ملک سے اپنے طور پر کوئی معاملہ طے کرنے لگ جائے۔ خود جماعتِ اسلامی کے اپنے دستور میں یہ دفعہ موجود ہے کہ اگر کوئی رکن جماعت کی اعلان کردہ پالیسی کے خلاف کام کرے گا تو اسے جماعت سے نکال دیا جائے گا۔[۶۱] ——— یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے کہ حکومت کا سخت سے سخت مخالف بھی اسے صرف حکومتِ وقت کا حق قرار دیتا ہے۔ لاہور کا مشہور ہفت روزہ چٹان اپنے ۱۵ مئی ۱۹۶۲ء کے شمارہ کے اداریہ میں اس اصول پر یوں گفتگو کرتا ہے۔

"غیر ملکی حکومتوں سے گفتگو کرنے اور اس کے ساتھ روابط پیدا کرنے کا حق صرف ملک کی حکومت کو ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کی کوئی جماعت اپنے طور پر یہ اقدام کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی نہیں، بلکہ کسی اور ملک کی گماشتہ ہے۔"

آیئے اب اس اصول کی روشنی میں دونوں جماعتوں کا طرزِ عمل دیکھیں۔

الاخوان المسلمون کا طرزِ عمل

یہ جماعت اس اصول کو کہ ملکی معاملات طے کرنے کے لئے غیر ممالک سے گفتگو کی جا سکتی ہے نہ صرف یہ کہ تسلیم کرتی ہے بلکہ اس پر عمل بھی کرتی رہتی ہے۔ نہر سویز سے برطانوی فوجوں کے انخلاء کے موقع پر جب حکومت اور اخوان کے درمیان چپقلش پیدا ہو گئی تھی تو اخوان کے

---

[۵۹] ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۷ء صفحہ ۴۴۴/۴۴۵ ، [۶۰] چراغ راہ، سوشلزم نمبر جلد ا۔ صفحہ ۳۳۶

[۶۱] ترجمان القرآن۔ جون جولائی ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۰۴/۲۰۵ ،

مرشد عام پروفیسر الہضیبی نے حکومت برطانیہ کے نمائندوں سے اس مسئلہ پر گفت و شنید کی۔ چنانچہ اخوان پر جب مقدمہ چلایا گیا تو ان کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا۔ اب دیکھئے جماعت اسلامی کی طرف سے اس واقعہ کی کیسی صفائی پیش کی گئی ہے۔

"اس کے علاوہ یہ الزام ہے کہ مسٹر ایونز (MR. EVANS) برطانوی سفارت خانہ کے عہدہ دار نے مرشد سے ملاقاتیں کیں۔ اس کا مسٹر ایونز اور اخوان دونوں کو اقرار ہے لیکن یہاں اتنا اور سن لیجئے کہ مسٹر ایونز مرشد کو بھائی بنانے آیا تھا۔ مرشد نے حکومت کے موقف کی پوری تائید کی اور فوراً ہی میجر صالح سالم وزیر الارشاد القومی کو بلا کر گفتگو کی تفصیلات سنا دیں۔ کیا نفس ملاقات بھی جرم ہے؟ مسٹر ایونز کا کہنا ہے کہ ملک کے مختلف النیال افراد سے ملنا اور ان کے افکار کا اندازہ لگانا ہمارے فرائض منصبی میں داخل ہے اور یہ کوئی جرم نہیں۔" ۷۶

اس عبارت کو ہم قارئین کے حوالے کرتے ہیں کہ وہ اس کا جو مفہوم چاہیں نکالیں ذرا آگے چلتے ہیں۔ نہر سویز کے سلسلہ میں حکومت اور اخوان کا بنیادی اختلاف یہ تھا کہ اخوان یہ مسئلہ لڑائی کے ذریعہ حل کرنا چاہتے تھے جبکہ حکومت مصر کو برطانیہ جیسی طاقت کے مقابلے میں اپنی فوجی طاقت کا علم تھا۔ اس نے اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ:

"مسلح لڑائی کا خیال تہور بے جا بلکہ کم عقلی اور کوتاہ نظری کی پیداوار ہے۔" ۷۷

چنانچہ انگریزوں سے پر امن بات چیت کے ذریعہ معاہدہ طے پا گیا۔ اخوان کی طرف سے بڑے زور شور سے مخالفت شروع ہوئی اور انہوں نے یہ اعلان کیا۔

"اخوان کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسے معاہدے کے موقع پر خاموش رہتے جس میں ایک طرف نہر سویز کا نمائشی تخلیہ تجویز کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف ایسی شرائط طے کی جا رہی ہیں جن میں مصری حقوق کی صریح پامالی صاف نظر آ رہی ہو۔" ۷۸

اس واقعہ کی یہ مختصر تفصیلات ہم نے اس لئے دی ہیں کہ اس کی روشنی میں مولانا مسعود عالم ندوی کی اس صفائی کو جانچئے کہ اخوان کے مرشد عام نے حکومت کے موقف کی تائید کی تھی۔ انگریزوں سے گفت و شنید کے الزام کی جو وضاحت خود الاخوان المسلمون کی طرف سے شائع کی گئی تھی وہ بھی ملاحظہ ہو۔

"اس کے بعد انقلابی کونسل اور برطانیہ کے مابین گفت و شنید کا مرحلہ درپیش آیا۔ اسی دوران میں برطانوی سفارت خانہ کے مشیر مسٹر ایونز نے الاستاذ الہضیبی سے ملاقات کی خواہش کی۔ ایک مشن کے حامل اور ایک جماعت کے قائد کی حیثیت سے مرشد عام کو پورا حق پہنچتا ہے بلکہ ان پر واجب ہے کہ وہ ہر انسان کے سامنے اپنا نظر اور نقطہ نظر پیش کریں خصوصاً جبکہ وہ خود اس کا طالب ہو۔" ۷۹

حکومت نے ایک دوسرے انگریز افسر مسٹر کرسویل (MR. CRESWEL) اور اخوان کے ایک اور لیڈر حسن عشماوی

---

۷۶ ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۷۵/۲۷۶ - ۷۷ ایضاً جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۴۲/۲۴۳ - ۷۸ ایضاً صفحہ ۲۴۳/۲۴۴

۷۹ ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۷۴/۲۷۵ ۔

کے درمیان بھی گفت و شنید کا الزام لگایا تھا جسے اخوان نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

جماعتِ اسلامی کا مسلک

یہ تو تھا اخوان کا مسلک اور جس طرح جماعتِ اسلامی کی طرف سے اس کے ساتھ اختلاف کرنے کے بجائے خود اخوان سے بھی زیادہ ان کی صفائی پیش کی جا رہی ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے اس طرزِ عمل کی تائید کر رہی ہے۔ اور جماعتِ اسلامی بھلا کسی غیر اسلامی اور غلط چیز کی تائید کب کرنے والی ہے ہاں حضرات نے اس سلسلے میں واضح طور پر تو کچھ نہیں کہا لیکن اشاروں کنایوں سے کچھ یہی جتلاتے رہے ہیں۔ کراچی کے ایک اجتماع میں امیر جماعتِ اسلامی نے مغربی ممالک کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے مسلم ممالک کے حکمرانوں سے سازباز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔[۴۱]

پھر اس سے ملتی جلتی امیر جماعتِ اسلامی کی تقریر راقم السطور نے لاہور میں اپنے کانوں سے سنی جس کے مندرجہ ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں۔

> اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ خود اینگلو امریکی بلاک کو بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ صرف مسلمان حکمرانوں سے معاملہ کرنا چاہتا ہے اور اس کو مسلمان قوم کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کرنا ہے تو الگ بات ہے۔ لیکن اگر اس کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے عوام بھی اس کے ساتھ تعاون کریں تو اس معاملے میں ہمیں صاف صاف بتا دینا چاہیئے کہ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آ رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔[۴۲]

مولانا مودودی کے دورہ کا خرچ

بھارت کے ایک ممتاز ندوی عالم مولانا محمد اسمٰعیل مصر کے مدرسۃ الالسن العلیا میں پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر و بشیر لکھنؤ کے صدقِ جدید میں عالمِ عرب کے متعلق ان کے مراسلے شائع ہوتے رہتے ہیں، کبھی نام کے ساتھ اور جب کسی مصلحت کا تقاضا ہو تو مدیر صدقِ جدید انہیں "ایک ممتاز ندوی مقیم مصر" لکھ دیتے ہیں۔ ان کے ایسے ہی مراسلوں میں سے ایک مراسلہ کا یہ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

> "مجھے خود مصر کے اخوانیوں نے بتایا کہ واقعی اس جماعت کی تشکیل کے وقت اس کے پہلے ہی اجلاس میں حکومت امریکہ کا ایک نمائندہ شریک رہا۔ اس طرح جماعتِ اسلامی کو لیجئے۔ آج سے پانچ چھ سال پہلے بیروت کے سیاسی حلقوں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ امریکہ کے خرچ اور اشارے پر یہ دورہ کر رہے ہیں۔ پھر اس کی توثیق اس وقت ہوئی جب مولانا مودودی قاہرہ آئے اور ہم لوگوں کے سامنے اعتراف کیا کہ واقعی سعودی حکومت نے انہیں مصر کے دورہ کے لئے دو یا تین ہزار روپے بطور ہدیہ دیئے ہیں کہ مولانا کوہ طور کی تجلیاں دیکھیں۔ اور اپنے تاثرات کو اپنی تفسیر میں قلمبند کریں۔ ...."[۴۳]

---

[۴۱] روزنامہ تسنیم، لاہور، مورخہ ۱۲ / ۱۶ ۵۵ء۔ [۴۲] روزنامہ تسنیم لاہور، مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء
[۴۳] صدقِ جدید، لکھنؤ۔ ۵ جون ۱۹۶۵ء۔

مولانا مودودی صاحب کی طرف سے تردید

مولانا مودودی نے اس الزام کے خلاف صدقِ جدید میں یہ تردید شائع کرائی۔

"۲۵ جون (۱۹۶۵ء) کے صدق میں صفحہ ۵ پر ایک ممتاز ندوی مقیم مصر کا ایک مکتوب جو آپ نے نقل فرمایا ہے اس میں چونکہ ایک بالکل خلاف واقعہ بات میری طرف منسوب کی گئی ہے اس لئے میں آپ کو اصل واقعہ سے مطلع کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے لکھا کہ ——

"جب مولانا مودودی قاہرہ آئے اور ہم لوگوں کے سامنے اعتراف کیا کہ واقعی سعودی حکومت نے انہیں مصر کے دورے کے لئے دو یا تین ہزار روپے بطور ہدیہ دیئے ہیں کہ مولانا کوہ طور کی تجلیاں دیکھیں اور اپنے تاثرات کو اپنی تفسیر میں قلمبند کریں۔" ——

—— صاحب موصوف کا یہ بیان قطعی غلط ہے۔ جو بات میں نے بیان کی تھی وہ یہ تھی کہ اس دورے کے سلسلے میں جب میں ریاض پہنچا تو شاہ سعود کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ جب تک تم سعودی عرب میں ہو ہمارے مہمان ہو۔ اس مملکت میں اپنی علمی تحقیقات کے لئے تم جتنی مدت رہو اور جہاں جہاں سفر کرو اسکے مصارف ہمارے ذمہ رہیں گے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے انہوں نے تین ہزار ریال عنایت فرمائے اور اس کی وجہ سے مجھے طائف سے لے کر تبوک مدین تک ایک وسیع علاقے میں پھرنے کی سہولت حاصل ہو گئی۔

یہ اصل واقعہ ہے اب اس سے جو نتائج کسی کا دل چاہے نکالتا رہے۔" ۲۴؎

الاخوان المسلمون اور اسلام کا معاشی نظام

جماعت اسلامی والے ویسے تو اخوان کے لٹریچر کا ایک ایک لفظ اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کا معاشی نقطۂ نظر جماعت اسلامی کے تجویز کردہ اسلامی معاشی نظام سے ٹکراتا ہے۔ اس لئے عام طور پر اس سے چشم پوشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اخوان نے اسلامی اصولوں کی روشنی میں مصر کے لئے جو پروگرام تجویز کیا تھا وہ ہم ان کے ایک مشہور عالم اور لیڈر شیخ محمد الغزالی کی کتاب "الاسلام والاوضاع الاقتصادیہ" سے نقل کرتے ہیں۔

(۱) عام ضرورت کی چیزوں کو قومی ملکیت قرار دینا، کمپنیوں کی اجارہ داری کو ختم کرنا اور کسی فردِ واحد کو مرافقِ عامہ میں تصرف کا حق نہ دینا۔

(۲) بڑی زمینداریوں کو کم کرنا اور زرعی مزدوروں کو تدریجی طور پر زمینوں کا مالک بنانا۔

(۳) جمع شدہ دولت پر ٹیکس عاید کرنا۔

(۴) غیر ملکیوں سے زمین واپس لینا۔

(۵) مزدوروں کی مزدوری کو کارخانوں کے منافع کے ساتھ اس طرح وابستہ کرنا کہ عام مزدوری کے علاوہ منافع میں بھی کچھ حصہ ہو۔

۲۴؎ صدق جدید لکھنؤ ۔ ۲۳ جولائی ۱۹۶۵ء ۔ صفحہ ۸

(۴) میراث پر زاید محصول (ضربیہ تصاعدیہ PROGRESSIVE RATE OF TAXATION) عاید کرنا، اور منشاءِ قرآنی کے مطابق اسے مفادِ عامہ کے کاموں میں خرچ کرنا۔[۳۵]

اخوان کے معاشی پروگرام کا یہ خلاصہ مولانا مسعود عالم ندوی نے ترجمان القرآن میں شائع کر دیا تھا اور ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی اختلافی نوٹ نہیں دیا تھا بلکہ ایک تائیدی نوٹ دیا تھا کہ یہ تجاویز شاید کچھ سخت اور انتہا پسندانہ معلوم ہوں مگر مصر کی موجودہ معاشی صورتِ حال کا یہ لازمی حل ہے۔[۳۶] اخوان کی طرف سے اسے اسلامی سوشلزم کا نام دیا گیا۔ اس کی تفصیلات آگے آتی ہیں۔ صدر ناصر نے اخوان المسلمین کا رکن ہونے کی حیثیت سے ان کے پروگرام پر عمل کرنے کے لئے جو حلفیہ دستخط کئے تھے اس کے مطابق انہوں نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ اس عملی پروگرام کی پوری تفصیلات پاکستان ٹائمز لاہور کے سنڈے میگزین بابت مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء؛ اور ۷ اپریل ۱۹۶۳ء میں چھپ چکی ہیں۔ صدر جمال عبدالناصر کے بعض اقدامات جو ہوا اخوان کے مذکورہ بالا پروگرام سے جزئیات کی حد تک ملتے ہیں۔ ان اصلاحات میں صدر ناصر نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ ملک میں کسی فرد کی سالانہ آمدنی کسی صورت میں اسی ہزار روپے سے زاید نہ ہو۔[۳۷]

لیکن بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر اخوان کے بعض لیڈروں نے اس کی مخالفت کی، بعض نے اسے پسند کیا اور صدر ناصر کے تحت عہدے قبول کئے۔ اخوان کے ایک اہم لیڈر شیخ باقوری صدر ناصر کی وزارت میں شامل ہو گئے۔ لیکن اس سے اخوان سے چپقلش میں کمی کی بجائے کچھ زیادتی ہو گئی۔ زرعی زمین کی حد بندی کے بارے میں ان کے اختلاف کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

جماعتِ اسلامی کا معاشی مسلک

جماعتِ اسلامی کا معاشی مسلک، اخوان کے اوپر بیان کردہ معاشی پروگرام کے بالکل الٹ ہے۔ بلکہ جماعتِ اسلامی والے تو ایسی اصلاحات کو کمیونزم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس بارے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات یہ ہیں۔

"سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔[۳۸] ——— اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے، جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عاید کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنے صنعتی کاروبار، اتنے موٹریں، اتنی مویشی، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اتنی تجارت، یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو، اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ

---

[۳۵] ماہنامہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۱ء، صفحہ ۳۸۵/۱۲، ۳۸۶/۱۲ — [۳۶] ایضاً۔

[۳۷] پاکستان ٹائمز - ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء سنڈے میگزین صفحہ ۱۷ — [۳۸] مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۱۱

تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو۔ اس طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔[۴۹]

جماعت کی طرف سے اسلام کا یہ معاشی اصول ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ پیش کیا گیا تھا۔

جماعت اسلامی کا نیا معاشی مسلک

اب اٹھارہ سال کے بعد انہوں نے اپنے مسلک کے اس بنیادی اصول کو بدل کر اصولِ تحدید کو پیش کیا ہے جس کی کچھ تفصیلات انہی کی زبانی سنیئے۔

اصولِ تحدید۔ لیکن غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ضرورت کی حد تک اصولِ تحدید مقدار کو خاصے بڑے پیمانے پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔[۵۰]

—سرمایہ کاری پر تحدید کی صورت یہ ہے کہ ایک فرد (یا شرکت کفالت کے ایک خاندان کے افراد) کے لئے ایک حد مقرر کر دی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا سرمایہ کاروبار میں لگا سکتے ہیں۔ مثلاً شخص واحد کے لئے ایک یا چند لاکھ روپے کی حد رکھی جا سکتی ہے۔[۵۱]

دیکھئے ایک چیز مصر میں عین اسلام تھی اور پاکستان میں کچھ عرصہ تک اسلام کی ضد لہٰذا کفر۔ لیکن اب کچھ کچھ اسلام کے مطابق ہو چلی ہے۔

اسلامی سوشلزم

آجکل جماعتِ اسلامی والے اس اصطلاح کے پیچھے بڑی بُری طرح پڑے ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف اس تخیل کی تردید کے لئے انہوں نے اپنے ایک ماہنامہ "چراغِ راہ" کا ایک ضخیم خصوصی نمبر نکالا ہے لیکن قارئین یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اسلامی دنیا کو سب سے پہلے اس اصطلاح سے روشناس کرانے والے الاخوان المسلمون ہیں۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں اس موضوع پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں، بلکہ خاص اس عنوان پر مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن میں سے شیخ مصطفےٰ السباعی کی اشتراکیۃ الاسلام (اسلامی سوشلزم) نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔

—اخوان کے ایک دوسرے مشہور لیڈر شیخ محمد الغزالی (جنہوں نے اسلام کے معاشی نظام پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کا کچھ ذکر پہلے گزر چکا ہے) وہ اپنے تجویز کردہ پروگرام کو اسلامی سوشلزم ہی کا نام دیتے ہیں۔ بعض لوگ چونکہ دانستہ "سوشلزم اور کمیونزم" کو ایک شے قرار دے کر غلط مبحث کی کوشش کرتے ہیں (جس طرح جماعتِ اسلامی کے چراغِ راہ کے سوشلزم نمبر میں کیا گیا ہے۔) تو اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے شیخ محمد الغزالی نے ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی جس کا عنوان ہے

"الاسلامُ المفترىٰ علیه بین الشیوعین والرأسمالیین"

(کمیونسٹوں اور سرمایہ داروں کی رسہ کشی میں بدنام اسلام کا موقف۔)

۴۹۔ مسئلہ ملکیت زمین۔ صفحہ ۱۱۵۔ ۵۰۔ چراغ راہ سوشلزم نمبر جلد ۱۔ صفحہ ۵۱۷۔ ۵۱۔ ایضاً۔ صفحہ ۵۱۵۔

اس کتاب کا مضمون ان کی پہلی کتاب الاقتصاد فی الاسلام سے ملتا جلتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جہاں یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام سرمایہ داری اور شیوعیت یعنی کمیونزم کا دشمن ہے وہاں اسلام کا جو معاشی نظام پیش کیا ہے اسے وہ اسلامی سوشلزم کا نام دیتے ہیں ——

—— اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے ایک سابق امیر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی فرماتے ہیں کہ پہلی چیز جو کتاب کی ہر ہر سطر میں نمایاں نظر آتی ہے وہ ایک داعی کی تڑپ ہے...... البتہ ہمیں ان کی اصطلاح "اسلامی سوشلزم" (الاشتراکیۃ الاسلامیۃ) سے سخت اختلاف ہے[۱۲]

جماعت اسلامی اور اسلامی سوشلزم

اب دیکھئے کہ جہاں اخوان کے نزدیک اسلامی سوشلزم عین اسلام ہے، وہیں یہ جماعت اسلامی کے نزدیک حرام بلکہ حرام سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ ابھی حال ہی میں ان کی طرف سے جو رسالہ چراغ راہ کا ایک ضخیم سوشلزم نمبر صرف اسی کے توڑ کے لئے نکالا گیا ہے، اس میں اسلامی سوشلزم کا نام لینے والوں کو اس کی برائیاں گنانے کے بعد یہ شرعی وعید سنائی گئی ہے۔ کہ

"شارع علیہ السلام نے ایسی نئی باتیں نکالنے ہی کو بدعت قرار دیا تھا اور بدعت کو ضلالت کی تعریف میں داخل کیا تھا۔ دراصل بدعت تحریفِ دین کا دروازہ ہے"[۱۳]

اب دیکھئے کہ ایک ہی چیز یعنی "اسلامی سوشلزم" ایک ملک کے اسلامی نظام میں عین اسلام ہو گی اور دوسرے ملک کے اسلامی نظام میں عین کفر۔

ہر صورت میں حکومت کی مخالفت

ان دو جماعتوں میں ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت کی مخالفت کی جائے۔ اسلامی نظام کے لئے ان کی طرف سے جو جہاد کیا جا رہا ہے وہ صرف اتنے تک محدود رہا ہے کہ حکومت سے اس کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے۔ اب مصیبت یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک اسلامی قانون کی اصطلاحی تعریف (DEFINITION) تک نہیں کی گئی۔ چنانچہ اگر حکومت اس طرف کوئی قدم اٹھاتی ہے تو مخالفت کا موقع موجود رہتا ہے۔ اس وقت تک اس کی وضاحت نہ ہو سکے گی جب تک اس کی ایک مثال سامنے نہ لائی جائے۔ اس لئے ہم عائلی قوانین کے متعلق جماعت اسلامی کا طرزِ عمل پیش کرتے ہیں کہ وہی چیزیں جو ان کی اپنی تشریح کے مطابق پہلے اسلامی تھیں، جب حکومت نے انہیں نافذ کیا تو انہی کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اسی طرح اخوان نے حکومت مصر سے اسلام کے معاشی نظام کے سلسلے میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ بڑی زمینداریوں کو کم کر کے زرعی مزدوروں کو تدریجی طور پر زمینوں کا مالک بنا دیا جائے[۱۴] لیکن جب حکومت نے اس کو نافذ کرنا چاہا تو سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوئی۔

---

۱۲ ترجمان القرآن - بابت ستمبر ۱۹۵۱ء - صفحہ ۳۸۹/۱۱۷

۱۳ چراغ راہ - سوشلزم نمبر جلد ۱ - صفحہ ۵۰۳۔

۱۴ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۱ صفحہ ۳۸۵/۱۴

عائلی قوانین

ملک میں عائلی قوانین کے نفاذ سے کوئی تیس سال پہلے مولانا مودودی نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا عنوان ہے "حقوق الزوجین"[6]۔ اس میں اُس وقت کے عائلی نظامِ زندگی (جو حنفی فقہ کے مطابق تھا) کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس سے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۵۰ فیصدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے کی زندگیاں تلخ بلکہ برباد کر دی ہیں[7] ــــــ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے عائلی نظامِ زندگی کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کیں۔ جو زیادہ تر انہی اصلاحات پر مشتمل تھیں جو مصر میں نافذ ہو چکی تھیں۔ خیال ہے کہ مصر میں ان کے نفاذ پر الاخوان المسلمون نے ان کی مخالفت نہیں کی تھی، بلکہ تائید کی تھی۔ وہاں کے اسلامی نظام کے مطالبہ کرنے والوں نے تو اس پر گھی کے چراغ جلائے تھے[8]۔

اب دیکھئے کہ یہ حضرات اپنے تسلیم شدہ اسلامی قانون کی کس طرح مخالفت کرتے ہیں۔ عائلی قوانین کی اہم دفعہ کی رُو سے طلاق بدعت یعنی ایک ہی مجلس میں تین طلاق دینے کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے متعلق مولانا مودودی نے 'حقوق الزوجین' میں یہ لکھا تھا۔

> "بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا بالنصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے ــــــ ان خرابیوں کے سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عاید کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں"[9]

لیکن ہم حیران رہ گئے کہ جب خود امیر جماعت اسلامی کے تجویز کردہ علاج کے مطابق اس قسم کی طلاق پر عائلی قوانین کی رُو سے پابندیاں عاید کر دی گئیں تو یہی حضرات اس کی مخالفت کرنے لگے۔ اور ہم ان کی مخالفت کی وجہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو گئے چنانچہ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے اعتراض کو ان الفاظ میں لوگوں کے سامنے لائے۔

> "بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے۔ لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے"[10]

---

[6] راقم "فکر و نظر" بابت اکتوبر ۱۹۶۵ء میں عائلی قوانین اور "حقوق الزوجین" کے تقابلی مطالعہ سے یہ ثابت کر چکا ہے کہ دونوں میں صرف اصطلاحات کا فرق ہے۔ مضمون تقریباً ایک ہے۔

[7] حقوق الزوجین۔ صفحہ ۹ طبع ششم۔

[8] نکاح محمدی شائع کردہ مکتبہ شعیب کراچی صفحہ ۲۱، ۲۲

[9] حقوق الزوجین۔ صفحہ ۱۵۴ - ۱۵۵ ، [10] عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحہ ۱۸

اس طرح سے حکومت کی مخالفت کے جوش میں وہ چیز جس معصیت اور بدعت پر اجماعِ امت تھا اب وہ عین اسلام بن گئی! حالانکہ اپنے اعتراض کی تقویت کے لئے جسے حنفی مذہب کے خلاف بتایا جا رہا ہے' وہ حنفی مذہب میں طلاق دینے کا سب سے احسن طریقہ ہے۔ یہ ہے اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کی طرف سے اسلامی قانون کے نفاذ کی مخالفت کی مثال۔

الاخوان المسلمون اور حکومت کی مخالفت

حکومت کی مخالفت میں ان کی قدرِ مشترک کو ثابت کرنے کے لئے ہم صرف انہی مثالوں کو سامنے لاتے ہیں جنہیں یہ حضرات خود اسلامی سمجھتے تھے اور حکومت سے اس کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن جب حکومت نے ان پر عمل کیا تو سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوئی۔

مصر کے لئے تجویز کردہ معاشی نظام کی کچھ تفصیلات ہم اخوان کی زبانی نقل کر چکے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم ترین زمین کا مسئلہ تھا کیونکہ ہماری طرح مصر کی ۷۵ فیصد آبادی اسی سے وابستہ ہے۔ اخوان نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ بڑی زمینداریوں کو کم کر کے زرعی مزدوروں کو تدریجی طور پر زمین کا مالک بنا دیا جائے[1] صدر ناصر جو کسی وقت الاخوان المسلمون کے باقاعدہ رکن تھے' نے' ان کے معاشی پروگرام پر عمل کرنے کا حلفیہ عہد کیا تھا۔ زمامِ حکومت سنبھالنے کے بعد جب انہوں نے اس پر عمل کرنا شروع کیا تو سب سے زیادہ مخالفت انہی اخوان کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس بارے میں صدر جمال عبدالناصر کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا۔

> التطبیق العربی الاشتراکی لا یؤمن بتامیم ملکیۃ الارض ولکن بزیادہ عدد الملاک[2]

> عرب سوشلزم کی تطبیق کا مقصد ارضی ملکیت کو سلب کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے سے مالکانِ ارضی کی تعداد میں اضافہ مقصود ہے۔

صدر ناصر بڑی زمینداریوں کو ختم کرنے کے لئے ایک شخص کے پچاس ایکڑ کی حد مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس اخوان کے مرشدِ عام پانچ سو ایکڑ کی حد مقرر کرانا چاہتے تھے۔ ان حضرات کا اسلامی استدلال ملاحظہ ہو کہ پانچ سو ایکڑ کی حد ہو تو اسلام اور پچاس ایکڑ کی حد ہو تو کمیونزم؟ زمیندار طبقہ میں اخوان کو بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا اس لئے اس معاملہ میں حکومت اور ان کے درمیان سخت تلخی پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ صدر ناصر کو مجبور ہو کر ۲۰۰ ایکڑ کی حد ماننی پڑی۔ چنانچہ الاخوان المسلمون پر جو مقدمہ چلایا گیا اس میں ایک الزام یہ بھی تھا۔ اس کی صفائی پیش کرتے ہوئے جماعتِ اسلامی کے دارالعروبہ کے ناظم مولانا مسعود عالم ندوی یوں لکھتے ہیں۔

> • رہا یہ اختلاف کہ زیادہ سے زیادہ زمین جو ایک شخص کے قبضہ میں دی جائے وہ دو سو ایکڑ ہو یا پانچ سو ایکڑ تو یہ مسئلہ کوئی اصولی اور ٹھوس مسئلہ نہیں ہے[3]۔ یعنی صاحب ملکیت کی تحدید کے مخالف

---

[1] ملاحظہ ہو حوالہ نمبر ۵۸۔ [2] النشرۃ الثقافیہ - مارچ و اپریل ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۲

[3] دیکھیے جس مسئلہ کا ملک کی ۷۵ فیصد آبادی کی معاشی زندگی سے گہرا تعلق ہے وہ ان کے نزدیک ٹھوس اور اصولی نہیں۔

نہیں سمجھتے۔ اُن کی رائے اگر پانچ سو ایکڑ کے حق میں تھی تو یہ کوئی معصیت نہیں تھی۔ ان سطور سے غلط فہمی نہ ہو، ہم محض ہضیبی صاحب کے موقف کو واضح کر رہے ہیں۔ ہماری اپنی رائے ملکیت کی تحدید و تنسیخ کے باب میں ان سے کچھ مختلف ہے[۵۳] جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے[۵۴]

الاخوان المسلمون کی مخالفت کو ختم کر دینے کے بعد صدر ناصر نے اپنے نظریہ کے مطابق اس ملکیت کی حد وہی پچاس ایکڑ مقرر کر دی (ملاحظہ ہو قانون نمبر ۱۲۷ سال ۱۹۶۱ء بحوالہ چراغ راہ سوشلزم نمبر صفحہ ۲۳۰)

اس نئے قانون کی حسب سابق پھر انہی لوگوں کی طرف سے مخالفت ہوئی جس کے نتائج کسی طور خوشگوار نہیں تھے۔ اس کی تفصیلات بھی جماعت اسلامی ہی کی زبانی سنیئے۔

"الاخوان المسلمون کے راہنما سید قطب اور ان کے دوسرے ساتھی صرف اسی جرم میں پھانسیوں پر لٹکا دیئے گئے کہ انہوں نے مصری معاشرے کے لئے سوشلزم کے نظریہ کو نامناسب اور غیر فطری قرار دیا تھا[۵۵]"

دیکھئے، ایک چیز کو اخوان والے اسلامی کر کے پیش کر رہے ہیں اور ان کا ایک رکن جب برسراقتدار آ کر اس کو عملاً نافذ کرنا چاہتا ہے تو اس کی آخری حد تک مخالفت کی جاتی ہے اور اس کے لئے ہر طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔

زکوٰۃ کے بارے میں ان کا مسلک

اسلامی نظام حیات کا معاشی ستون زکوٰۃ ہے۔ لیکن ان دونوں جماعتوں کی طرف سے اس کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں بھی زکوٰۃ کا وہی مفہوم سما چکا ہے جو صدیوں سے نظام زکوٰۃ پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے عامۃ الناس کے ذہن میں سمایا ہوا ہے۔ یعنی حکومت کا نظام چلانے کے لئے تو ٹیکس لگایا جائے گا اور زکوٰۃ کی رقم کو دینی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت کا معاشی نظام اس اصول پر مبنی ہو گا کہ ــــــ "جو خدا کا ہے خدا کو دے دو اور جو قیصر کا ہے قیصر کو دے دو۔"

اس مسئلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی ٹیکس نہیں۔ خیال یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا ٹیکس عبادت ہی تصور ہو گا۔ یہ رائے کسی ایک فقہی مذہب کی نہیں۔ بلکہ اس پر اجماع امت ہے۔ علامہ شعرانی لکھتے ہیں:۔

"اجمع العلماء ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ علیٰ انہ لیس فی المال سوی الزکوٰۃ[۵۶]"

فقہا کا اس امر پر اجماع ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس نہیں۔

---

[۵۳] جماعت اسلامی کا پہلا مسلک یہ تھا کہ ملکیت کی کسی قسم کی تحدید کرنی خلاف اسلام ہے۔ لیکن اب انہوں نے پہلا اسلامی مسلک بدل کر تحدید کے جواز کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کی تفصیلات "جماعت اسلامی کا نیا معاشی مسلک" کے زیر عنوان پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں۔

[۵۴] ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۲۳/۲۲۲۔

[۵۵] چراغ راہ سوشلزم نمبر صفحہ ۲۴۹ [۵۶] المیزان الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۳

اس بارے میں عام طور پر جو روایت "فی المال حق سوی الزکوٰۃ" سے استدلال کیا جاتا ہے وہ ان کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہے[۵۷]

لیکن اس اجماع کے خلاف دونوں جماعتوں کا مسلک ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس بھی لگایا جا سکتا ہے۔ پہلے اخوان کا مسلک دیکھئے ۔۔۔۔

۔۔۔ شیخ محمد الغزالی اپنی ایک کتاب میں اس مسئلہ پر علماء ازہر کے اسی اجماعِ امت کے مطابق فتویٰ کا جواب دیتے ہیں یہ فتوے کا خلاصہ یہ ہے کہ زکوٰۃ اور خراج وغیرہ کے علاوہ مال پر اور کوئی حق واجب نہیں۔ وہ اس فتوے کی تردید کرتے ہیں کہ اگر حکومت مفادِ عامہ کے پیشِ نظر کوئی ٹیکس عاید کرنا چاہے تو اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے"[۵۸]

امیر جماعتِ اسلامی نے بھی یہی فتوے دے رکھا ہے کہ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس بھی ہوں گے[۵۹] اور زکوٰۃ کو دینی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

یہ ہے ان دونوں جماعتوں کے نزدیک اسلام کے معاشی نظام کی تصویر کہ جو خدا کا ہے وہ خدا کو دے دو، اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے دو۔

خاندانی منصوبہ بندی

اس منصوبہ پر مصر میں پاکستان سے کئی سال پہلے عمل ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں جماعتِ اسلامی کی طرف سے اس کی جو مخالفت ہو رہی ہے اس سے قارئین ضرور واقف ہوں گے۔ مخالفت ہی نہیں بلکہ یہاں تک دھمکی دی جا رہی ہے کہ :

> اس ملک میں یہ تحریک ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے مال وجان کا زبردست زیان کرنا ہوگا۔ اور یہاں یہ اس وقت کامیاب ہو سکے گی جب یہاں کی عظیم اکثریت خدا اور اس کے رسول سے منہ موڑ لے[۶۰]

اس کے برعکس الاخوان المسلمون والوں نے اسے ایک انسانی اور اسلامی مسئلہ سمجھا ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے اس کی مخالفت میں ایک لفظ تک نہیں کہا بلکہ اس کے جواز کے فتوے دے رکھے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہاں کی خاندانی منصوبہ بندی کی کونسل کی رسمِ افتتاح تک الاخوان المسلمون کے بانی کے ہاتھوں کرائی گئی۔ اخوان کے چوٹی کے علماء میں سے علامہ البہی الخولی کا فتویٰ ان کی کتاب المرأۃ بین البیت والمجتمع میں بھی موجود ہے اور خالد محمد خالد کے فتویٰ کے ساتھ علیحدہ کتابچہ کی صورت میں بھی۔ دوسرا فتویٰ الشیخ السید سابق مصری کا فتویٰ ان کی کتاب فقہ السنہ جلد ۲ کے صفحہ ۱۲۳ پر ہے۔ ان دونوں فتاویٰ کو راقم اپنی کتاب "خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق سلف صالحین اور علمائے خلف کے فتوے" میں شامل کر کے شائع کرا چکا ہے۔ اس لئے یہاں انہیں دوبارہ نقل کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔

---

۵۷ احکام القرآن للجصاص جلد ۱ صفحہ ۵۹

۵۸ الاسلام المفتری علیہ بین الشیوعیین والرأسمالیین صفحہ ۱۴۰ بحوالہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۸۹/۱۱۲

۵۹ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۰۵/۳۵۲

۶۰ ترجمان القرآن اگست ۱۹۶۵ء (اشارات)

مسئلہ تصویر

موجودہ معاشرہ میں فوٹوگرافی نے بنیادی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن ہمارے اکثر علماء ابھی تک اس کے جواز اور عدم جواز کی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ فوٹو کے متعلق ایک واضح حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسی تصویر ہے جس کا کوئی سایہ نہیں اور ایسی تصویر کم و بیش ائمہ اربعہ کے نزدیک جائز ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۲ صفحہ ۴۱ - ۴۲۔ مصر میں الاخوان المسلمون کا مسلک دوسرے علماء کی نسبت کچھ ترقی پسندانہ ہے۔ جیسا کہ یہاں شروع میں جماعتِ اسلامی کا تھا۔ اس مسئلہ میں ان کا مسلک بڑا صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اس کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ ان کا رسالہ "الدعوۃ" باتصویر چھپا کرتا تھا۔[۱] اس کے برعکس اس معاملہ میں جماعتِ اسلامی والوں کا مسلک سانپ کے منہ میں چھچھوندر والا قصہ ہے کہ وہ اس کے جواز کے بھی علی الاعلان قائل نہیں لیکن اس کے بغیر ان کے لیڈروں کا گزارہ بھی نہیں۔ ان کے ہر پوز کے فوٹو اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ اس کی وضاحت ان کی طرف سے یہ کی جاتی ہے کہ یہ فوٹو بے خبری میں اور زبردستی لیے جاتے ہیں۔ ان کی یہ صفائی اس لئے قبول نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے ہاں جو دینی پیشوا صدق دل سے اسے ناجائز سمجھتے ہیں وہ پبلک میں آنے کے باوجود اخباری فوٹوگرافروں کو اس کا موقع مہیا نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی زبردستی ان کا فوٹو اتار لے تو ان کے متبعین وہ کیمرہ تک ضائع کر دیتے ہیں جو آئندہ کے لئے دوسروں کے لئے سبق ہوتا ہے۔

معیارِ زندگی

جماعتِ اسلامی والے اٹھتے بیٹھتے اپنے مخالفین کے مسرفانہ معیارِ زندگی پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب ان کے اپنے "طبقہ اعلیٰ" کے معیار کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ یہ تو عین مطابق سنتِ رسول اللہ ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ

> "(حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے) ایک بار ستائیس اونٹنیوں کے بدلے ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا۔ اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز پڑھی۔ یہ تفسیر تھی اس قولِ قرآنی کی کہ پوچھو کون ہے اللہ کی عطا کردہ زینت کو حرام کرنے والا"[۲]

یا للعجب! وہ رسولؐ جن کا کوئی جوڑا ترکہ میں نہیں رکھا گیا، ان حضرات کے قول کے مطابق، ستائیس اونٹنیوں کی قیمت کے برابر ایک جوڑہ کپڑے خریدتے ہیں۔

مرشدِ عام اور امیرِ جماعت

عربی زبان اور دینی اصطلاحات سے کماحقہٗ واقفیت کی وجہ سے اخوان نے اپنے سربراہ کے عہدے کا نام مرشدِ عام رکھا ہے، امیرِ جماعت نہیں رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت میں مسلمانوں کی حکومت کا ایک ہی امیر ہو سکتا ہے جو ان کے معاملات کی نگرانی کرے۔ دوسرے امیر کو حضرت عمرؓ نے ایک میان میں دو تلواریں قرار دی تھیں۔ (لا یجتمع سیفان فی غمد واحد[۳]) علمائے امت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی امیر ہو سکتا ہے۔ دوسرا اگر کوئی دعوے کرے تو اسے قتل کر دو۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب مسئلہ خلافت میں اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل

---

[۱] ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۴۱۹۔　[۲] محسن انسانیت از نعیم صدیقی۔ صفحہ ۹۶

[۳] الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ۔ صفحہ ۷

بحث کی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عجیب حالت ہے کہ حکومت کے سربراہ کے علاوہ کئی کئی امیر ہیں۔ اس کا نوٹس ہم نے اس لئے لیا ہے کہ یہ جماعتیں اپنے امیر کے لئے اسی اطاعت کا مطالبہ کرتی ہیں جو شریعت نے صرف مسلمانوں کے سربراہ کے لئے مخصوص کی ہے۔ جماعتِ اسلامی کا مسلک ان کی اپنی زبانی سنئے۔

"اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزء ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو اپنا امیر مانا ہے وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کرکے دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ جس قدر اللہ سے اور اس کے دین سے آدمی کا تعلق ہوگا اتنا ہی وہ سمع وطاعت میں بڑھا ہوا ہوگا اور جتنی اس تعلق میں کمی ہوگی اتنی ہی سمع وطاعت میں بھی کمی ہوگی۔ اس سے بڑی قابلِ قدر قربانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس شخص کا آپ پر کوئی زور نہیں ہے اور جسے محض خدا کے کام کے لئے آپ نے امیر مانا ہے اس کا حکم آپ ایک وفادار ماتحت کی طرح مانیں اور اپنی خواہش اور پسند اور مفاد کے خلاف اس کے ناگوار احکام تک کی بسروچشم تعمیل کرتے چلے جائیں۔ یہ قربانی چونکہ اللہ کے لئے ہے اس لئے اس کا اجر بھی اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس کام میں شریک ہونے کے بعد بھی کسی حال میں چھوٹا بننے پر راضی نہ ہو اور اطاعت کو اپنے مرتبے سے گری ہوئی چیز سمجھے یا حکم کی چوٹ اپنے نفس کی گہرائیوں میں محسوس کرے اور تلخی کے ساتھ اس پر تلملائے ..... وہ دراصل اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ابھی اس کے نفس نے اللہ کے آگے پوری طرح سرِ اطاعت خم نہیں کیا ہے"[۳۸]

یہ الفاظ خود امیر جماعتِ اسلامی کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ دیکھئے کس طرح اللہ اور رسولؐ کے نام پر آج کی اصطلاح سیاست کے اندر ریاست قائم کی جارہی ہے۔

ان جماعتوں کے مطالبۂ نظامِ اسلامی کا عارضی انجام

الاخوان المسلمون کے متعلق جو تفصیلات نقل کی جاچکی ہیں، ان کی وجہ سے ان کے لئے کسی عرب یا اسلامی ملک میں اپنا مرکز قائم رکھنا ممکن ہی نہیں رہا۔ اب ان لوگوں نے اپنا مرکز یورپ میں جنیوا کے مقام پر بنا رکھا ہے۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ یہ لوگ دنیا کے اس سب سے مہنگے مقام پہ خرچ کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ پاکستان میں جماعتِ اسلامی 'اسلامی نظام کے قیام' سے عارضی طور پر دستبردار ہو کر 'جمہوریت کی بحالی' کی مہم میں دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ شریکِ عمل ہو چکی ہے۔ عام لوگوں کی نظروں میں شاید جماعت کا یہ اقدام کوئی بڑی اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن دینی حلقوں کو اس سے جو صدمہ پہنچا ہے وہ خود ان کے ایک خیرخواہ اور برصغیر کے مشہور عالمِ دین مولانا عبدالماجد دریابادی کے اس خون سے لکھے ہوئے شذرے سے نکلئے۔ اس اقدام کا وہ یہ عنوان قائم کرتے ہیں۔" المیۂ پاکستان "۔ پھر فرماتے ہیں:

---

[۳۸] ترجمان القرآن، اپریل دمئی ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۹

"مولانا مودودی مرحوم ہوگئے۔ مولانا مودودی ماشاء اللہ زندہ وسلامت ہیں۔ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں کیسے صحیح ہوسکتی ہیں اور ان میں سے پہلا دعویٰ تو صریحاً صحیح ہے۔ جی نہیں! دونوں باتیں ایک ہی وقت میں صحیح ہیں۔ جو مولانا مودودی رحلت فرما گئے اور یہ واقعہ معمولی درجے کا نہیں بڑے ہی دکھ اور رنج کا ہے۔ وہ دینا کے ممتاز عالم تھے، مفسر قرآن تھے، متکلم تھے، اقامت دین اور حکومت الٰہیہ کے علمبردار تھے۔ ایک مستقل وسراپا دینی شخصیت رکھتے تھے۔ ایک ایسی ہستی کا اٹھ جانا ساری ملت کے لئے ایک حادثہ کا حکم رکھتا ہے۔ حدود پاکستان کے باہر بھی اسی قدر جس طرح پاکستان کے اندر۔ اب جو مولانا مودودی ماشاء اللہ موجود وسرگرم عمل ہیں وہ ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ جس طرح اور پارٹیوں کے لیڈر موجود ہیں اور ہر ملک میں نرم وگرم، رطب ویابس، قسم کے لیڈر تو ہی کرتے ہیں[۶۵]"

یہ شذرہ بڑا لمبا چوڑا ہے۔ قارئین اگر صدق کا یہ شمارہ تلاش کر سکیں تو اسے ضرور دیکھیں۔ طوالت سے بچنے کے لئے ہم اوپر کے اقتباس کے بعد اس کا آخری حصہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

"مسئلہ جمہوریت یوں بھی دینی نقطۂ نگاہ سے بس ایک حقیر سے جزئیہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے، چہ جائیکہ جب سوال نفس جمہوریت کا بھی نہیں بلکہ اس کی دو متبادل شکلوں (برطانوی اور امریکی) کا ہو۔ حکومتِ الٰہیہ کے علمبردار کے پاس تو صرف ایک ہی جواب ہونا تھا۔ ؎

مزہ ہو یا نگہ ہو جسم تو دونوں کو بلا سمجھے
اُسے تیر قضا اس کو پر تیر قضا سمجھے

حیف وصد ہزار حیف کہ اس کی قیمت آج اتنی اونچی سمجھ لی گئی کہ قبائے امامت کو بے تکلف سیاسی لیڈری کے گون پر نثار کر دیا گیا۔ شیطان اور اسکے سارے حزب کو اتنی مسرت وشادمانی اپنی کامیابی و فتحمندی پر حال وماضی قریب میں کیوں نصیب ہوئی ہوگی!

جانتا ہوں کہ اب اس آہ وبکا نالہ وفریاد سے حاصل کچھ بھی نہیں۔ جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ؟ اور وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا۔ تقدیرات تکوینی کون آج تک بدل سکا ہے۔ لیکن صدمہ سے تاثر بھی ایک امر طبعی ہے اور پھر جو صدمہ ملی اس طول وعرض اور اس حجم وضخامت کا ہو اس پر صبر آجانا تو آسان سے بھی نہیں۔ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ[۶۶]"

حرفِ آخر

ہمارے پاس اگرچہ ایسی معلومات کے دوسرے ذرائع بھی تھے لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ حوالہ جات خود جماعت اسلامی کے جرائد ورسائل اور لٹریچر سے پیش کئے جائیں یا وہ ایسے ہوں جو ان کے نزدیک معتمد ہوں۔ ہم ہر معقول آدمی سے چاہے وہ جماعت میں شامل ہے یا نہیں، یہ توقع کریں گے کہ اسلام کے نام پر قائم ہونیوالی ان جماعتوں کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرتے وقت ان کے متعلق مندرجہ بالا تفصیلات پر ایک نظر ضرور ڈال لے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

[۶۵] صدق جدید لکھنؤ۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۵ [۶۶] ایضاً (۲) حرف۔

حقائق و عبر

۱۔ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے چاہیے!

آپ پہلے ان الفاظ کو غور سے پڑھیے ۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہو۔ اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لیڈروں کے ذہن میں اس وقت کچھ ہی ہو کم از کم زبانوں سے انہوں نے ہر اسٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پر یقین کر کے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

(دستوری سفارشات پر تنقید۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ

پاکستان کی وجہ جواز ہی ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین ملنا چاہیے جس میں ہم اپنے تہذیب و تمدن کو از سرِ نو قائم کر سکیں اور اپنے دین کے اصولوں پر اپنی زندگی کو نشو و نما دے سکیں۔

(سید ابوالاعلےٰ مودودی۔ بحوالہ ایشیا یکم ستمبر ۱۹۶۸ء)

اور یہ بھی۔

۱۹۳۷ء تک یہی حالت رہی لیکن فقرو الی اللہ کی پکار کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ان سب سیاسی نصب العینوں سے مایوس ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی نجات اسلام ہی میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلم لیگ نے اس نصب العین کو اپنا لیا تھا۔ اس کے لیڈروں نے ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری مسلمان قوم اس کے علم تلے جمع ہو گئی۔

(ایشیا ۔ ۵ مر اگست ۱۹۶۸ء ۔ اداریہ)

آپ نے ان اقتباسات سے دیکھ لیا کہ ۱۹۳۷ء کے بعد سے مسلمانانِ ہند نے اپنا نصب العین یہ متعین کر لیا تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں اسلامی قوانین کے مطابق حکومت قائم ہو سکے۔ اور یہ کہ مسلم لیگ کے لیڈر ہر اسٹیج اور منبر سے اسی مطالبہ کا اعلان کرتے چلے جا رہے تھے۔ اب اس کے ساتھ مودودی صاحب کے اس اعلان کو ملاحظہ فرمائیے جس سے مسلمانوں

کو تحریکِ پاکستان کے خلاف ورغلایا کرتے تھے۔ وہ اعلان یہ تھا کہ

اس موقعہ پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں یہ بات آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان القرآن - جلد ۱۸ - عدد ۱ - صفحہ ۲۷)

آپ ذرا دریافت کیجئے جماعتِ اسلامی کے "صالحین" سے کہ مودودی صاحب کے ان ہردو اعلانات میں سے کون سا صحیح ہے؟ کیا یہ اعلان صحیح ہے کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے اس کی وضاحت نہیں کی تھی کہ ان کا مطمحِ نگاہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے' یا یہ اعلان کہ ہر اسٹیج اور ہر منبر سے اس کی وضاحت کی جاتی تھی کہ مسلم لیگ کا نصب العین ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول ہے جس میں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی؟ لیکن "صالحین" کی طرف سے اس کا جواب گالیوں کے سوا اور کیا ہوگا۔

۲۔ ایک اور

۱۴ اگست ۱۹۶۸ء کے جلسۂ عام میں مودودی صاحب کی تقریر۔

بلاشبہ ہمیں یہ آزادی حاصل ہوئی کہ ایک غیر قوم کی غلامی سے اللہ تعالیٰ نے نجات دے دی۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے جس نسل نے تقسیم کے بعد آنکھیں کھولی ہیں' یا قیامِ پاکستان کے بعد ہوش سنبھالا ہے۔ اس کے لئے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ غلامی کے دور میں ہماری حالت کیا تھی۔ (ایشیا - ۱۸ اگست ۱۹۶۸ء)

اس سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک 'ہندوستان کے مسلمانوں کا انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کر لینا بھی' خدا کی بہت بڑی نعمت تھی۔

لیکن جب مسلمان 'ہندوستان میں' انگریز (اور ہندو) کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے' تو مودودی صاحب فرماتے تھے۔ کہ

ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغانی حکمران ہوں ...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے ...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے ...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ (ترجمان القرآن - ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

آپ ذرا ان حضرات سے پوچھئے کہ جب" مسلمان ہونے کی حیثیت سے" مودودی صاحب کے نزدیک انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتا تھا تو آج جو یہ کہا جا رہا ہے کہ انگریز کی غلامی سے نجات حاصل ہو جانا اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت تھی، تو مودودی صاحب یہ کچھ کس حیثیت سے فرما رہے ہیں؟

جماعت اسلامی والے اس کے جواب میں کہیں گے کہ مودودی صاحب نے جب تحریکِ پاکستان کے دوران یہ کچھ کہا تھا کہ انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کر لینا کچھ قدر وقیمت نہیں رکھتا تو ان کا مطلب یہ تھا کہ اصل چیز یہ ہے کہ اس آزادی کے بعد آپ اسلامی حکومت قائم کرتے ہیں یا نہیں۔

لیکن ۱۴ اگست ۱۹۷۸ء کی تقریر میں انہوں نے دو چیزوں کو الگ الگ خدا کی نعمت قرار دیا ہے۔ یعنی انگریز کی غلامی سے نجات مل جانا، ایک نعمت۔ اور اس خطۂ زمین میں اسلامی حکومت کا قیام، خدا کی دوسری نعمت۔ لیکن تحریکِ پاکستان کے دوران وہ پہلی نعمت کو نعمت ہی تسلیم نہیں کرتے تھے اس لئے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کی نگاہوں میں اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں تھی۔

اور پھر اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران (خود مودودی صاحب کے الفاظ کے مطابق) ہر اسٹیج اور منبر سے اس کا اعلان ہوتا تھا کہ مسلم لیگ کا مطمحِ نگاہ، انگریز سے آزادی حاصل کر کے پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے۔

لیکن اس کے باوجود، مودودی صاحب تقسیمِ ہند کے وقت تک برابر چلاتے جا رہے تھے کہ مطالبۂ پاکستان کی تحریک غیر اسلامی ہے۔ اس کا قطعاً ساتھ نہیں دینا چاہیئے۔ ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء میں ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مودودی صاحب سے یہ سوال کیا گیا کہ جب غیر مسلم (انگریز اور ہندو) مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے تک کے درپے ہو رہے ہوں، تو کم از کم اس حد تک ہی ہمیں مسلم لیگ کا ساتھ دے دینا چاہیئے کہ مسلمان ان دشمنوں کی غلامی سے نجات حاصل کر سکے۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا:-

> ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے۔ .... لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں، تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ (ترجمان القرآن - جلد ۳۰ - عدد ۲)

اور اس کے باوجود یہ حضرات نہایت ڈھٹائی سے دہراتے چلے جاتے ہیں کہ ہم نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔

—— میکیاولی سیاست، زندہ باد!! ——

———(۰)———

خطرہ یہ ہے کہ ....

ترجمان القرآن (بابت اگست ۱۹۷۸ء) کے باب "رسائل و مسائل" میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اگر

وسائلِ پیداوار انفرادی ملکیت سے نکال کر حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں، تو اسلام کی رُو سے یہ صورت کیسی ہوگی؟ عبدالحمید صدیقی صاحب نے فرمایا ہے۔

> اگر کسی ملک میں چند افراد یا چند خاندان وسائلِ پیداوار پر قبضہ کر کے عوام کے لئے عذاب بن سکتے ہیں اور ان سے نجات حاصل نہیں کی جا سکتی، تو ذرا اس حالت کا اندازہ کیجئے جبکہ معاشرہ کے محنت کشوں کی پوری قدرِ زائد، حکومت کے ہاتھوں میں چلی جائے جس کے چلانے والے بہرحال چند لوگ ہی ہوں گے، اور ان کے ہاتھ میں معاشی طاقت کے ساتھ ساتھ سیاسی طاقت بھی ہوگی اور محنت کش طبقے اس باجبروت طاقت کے سامنے بے بس ہوں گے۔ اس اعتراض کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ حکومت کے ہاتھ میں جو کچھ ہوگا، عوام اس کے مالک ہوں گے۔ لیکن یہ محض فریبِ نظر ہے۔ نظریاتی اعتبار سے خوش کن باتیں کر کے خواہ دل کو کتنا ہی بہلا لیا جائے، لیکن عملی حیثیت سے اس نظام میں زمامِ کار ایک مختصر سے طبقہ کے ہاتھ ہی میں ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طبقہ سیاسی اقتدار کا مالک بھی ہوتا ہے اور اسکے ساتھ ملک کے پورے وسائلِ پیداوار پر بھی قابض ہو جاتا ہے۔ ہمارے پاس آخر اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ طبقہ سرمایہ داروں کی طرح بے پناہ قوت پا کر ظالم اور مستبد نہیں ہو جائے گا اور وہ قدرِ زائد کی صورت میں جمع ہونے والی دولت کو عدل و انصاف ہی کے ساتھ معاشرہ کے ہر طبقہ میں تقسیم کرے گا۔

کم و بیش یہی کچھ خود مودودی صاحب نے، ایک بزمِ استفسارات میں فرمایا جس کی روئیداد ہفتہ وار ایشیا کی ۱۸ اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔

آپ ایک ثانیہ کے لئے، وسائلِ پیداوار کے سوال کو ایک طرف رکھ دیجئے اور صرف سیاسی اقتدار کے مسئلہ کو سامنے لائیے۔ کسی ملک میں سیاسی اقتدار سب سے بڑی قوت ہوتا ہے اور معاشی اقتدار درحقیقت سیاسی اقتدار کا ایک گوشہ ہوتا ہے۔ جماعتِ اسلامی ملک میں (اپنے تصور کے مطابق) جمہوری نظامِ سیاست قائم کرنے کی دعویدار ہے۔ اور اس کے لئے دلیل یہ دیتی ہے کہ اس میں اقتدار عوام کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ لیکن مندرجہ بالا بیان میں کہا یہ گیا ہے کہ

> یہ محض فریبِ نظر ہے۔ نظریاتی اعتبار سے خوش کن باتیں کر کے خواہ دل کو کتنا ہی بہلا لیا جائے لیکن عملی حیثیت سے اس نظام میں زمامِ کار ایک مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جس نظام میں زمامِ کار عوام کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ایک مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں رہے، کیا اسے جمہوری نظام کہا جا سکے گا اور کیا ایسا نظام اسلامی کہلا سکے گا؟ لیکن جب اس نظام کی اس بنیادی کمزوری کے باوجود اسے (اسلامی جماعت کے دعوے کے مطابق) اسلامی کہا جا سکتا ہے اور اس میں ڈکٹیٹرشپ کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا، تو اگر ملک کی معاشیات بھی اسی نظام کے ہاتھ میں چلی جائیں تو اس سے یہ نظام غیر اسلامی اور بدترین خطرات کا موجب کس طرح ہو جائے گا؟ اگر زمامِ کار کا چند ہاتھوں میں رہنا غیر اسلامی اور خطرات کا موجب ہے تو اس قسم کے سیاسی نظام کو بھی مردود قرار پا جانا چاہیئے۔ اور اگر اس سے سیاسی طور پر کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا تو پھر معاشیات پر اس کے اطلاق سے کیا قیامت آجائے گی؟

اس کے ساتھ ہی سوال یہ ہے کہ آپ معاشیات کو سیاسی نظام سے الگ کس طرح کر سکتے ہیں؟ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیاسی نظام تو انفرادی کی بجائے اجتماعی ہو لیکن معاشی نظام اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی رہے، جبکہ مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ

> اس قسم کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اسکا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔　　　(اسلام کا نظریہ سیاسی)

غور فرمائیے۔ مودودی صاحب کے تصور کی اسلامی حکومت میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو ذاتی اور شخصی (PERSONAL) نہیں رکھ سکتا۔ لیکن وسائل پیداوار ہر شخص کی ذاتی ملکیت میں رہیں گے۔!

کس قدر بدبختی ہے اس ملک کی جس میں اس قسم کے لوگ "مفکر، عالم اور امیر" تسلیم کر لئے جائیں!

(۰)

تحقیق کا دروازہ بند ہو چکا ہے!

ہفت روزہ ایشیا کی ۲۴ اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ادارہ تحقیقات اسلامی سے متعلق ایک استفسار کے جواب میں جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی کا جواب شائع ہوا ہے جس میں تحریر ہے کہ

> یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو امتِ محمدی کی تحقیقات کا مجموعہ ہے..... لہذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں، تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔

اس سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پاکستان میں تحقیقاتِ اسلامی کے کسی ادارہ کی ضرورت نہیں۔ ہم ان مفتی صاحب سے کچھ عرض کرنا تو بے سود سمجھتے ہیں، البتہ مدیر ایشیا سے اتنا دریافت کرنے کی اجازت ضرور چاہتے ہیں کہ انہیں اس فتوے کے درج اخبار کرتے وقت اپنے "مرشد و مولا" کے یہ الفاظ یاد تھے یا نہیں کہ

> دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ ذہنیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا اور اسلام کی تعلیم

۱؎ ایشیا کی ۲۰ اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کی شان میں ایک نظم شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "محترم مرشد و مولا"۔

دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ ص۶۷)

—————(○)—————

کتاب و سنت کی بات نہ کرو

روزنامہ "نوائے وقت" کی ۲۰ اگست کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

> سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس فضل اکبر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مرکز اور صوبوں میں سٹینڈنگ کمیٹیاں قائم کی جائیں جو حکومت کو موجودہ قوانین میں ترمیم اور ان کی تنسیخ کے لئے ضروری مشورے دیں۔ آپ نے کہا کہ مجوزہ کمیٹیاں تجربہ کار اور قابل وکلاء پر مشتمل ہونی چاہئیں ...... لیکن
> یہ کمیٹیاں یہ سفارش نہیں کر سکیں گی کہ موجودہ قوانین
> کس حد تک قرآن و سنت کے مطابق ہیں۔

یعنی آئینِ پاکستان کی بنیادی شق یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکے گا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ اور محترم چیف جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ ملک کے قوانین کے دوسرے اسقام کے متعلق تو گفتگو کی جا سکے گی لیکن اس سوال کو چھوا نہیں جائے گا کہ کون سا قانون قرآن و سنت کے خلاف ہے!

اب آپ نے سمجھا کہ طلوعِ اسلام جو شروع سے کہتا چلا آ رہا ہے کہ اس بات کا متفقہ علیہ طور پر فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا کہ فلاں قانون قرآن و سنت کے خلاف ہے یا نہیں، وہ کس قدر مبنی برحقیقت ہے۔ محترم چیف جسٹس صاحب اس حقیقت سے باخبر ہیں اسی لئے انہوں نے پہلے ہی یہ وارننگ دے دی ہے کہ دیکھنا کہیں اس مسئلہ کو نہ چھیڑ دینا۔ مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ یہ نہ آج تک حل ہو سکا ہے، نہ حل ہو سکے گا۔ باقی رہی آئینِ پاکستان کی مذکورہ بالا شق۔ سو اسے خط کی پیشانی پر لکھا ہوا (۸۶) سمجھو۔

—————(○)—————

بیرونی ممالک میں تبلیغ اسلام

اخبارات میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق، محکمہ اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر نے ۲ ستمبر کو راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس میں فرمایا کہ

> میں نے بیرونی ممالک میں (اسلام کی) تبلیغ کے سوال کے متعلق مرکزی حکومت کے متعلقہ سیکرٹری صاحبان سے بات چیت کی ہے اور فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ اس مسئلہ کو گورنرز کانفرنس کے سامنے پیش کیا جائے (انہوں نے کہا کہ) عیسائیوں اور یہودیوں کے، اسلام کے خلاف عالمگیر پراپیگنڈہ کا اثر یہ ہے کہ اسلام کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ممالک میں اسلام کو ایک عجیب سی شے سمجھا جاتا ہے۔ ایک اسلامی ملک ہونے کی حیثیت سے، پاکستان کا فریضہ ہے کہ وہ اسلام کو اس کی

صحیح شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرے اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دے۔

(پاکستان ٹائمز - ۱۴ ستمبر ۱۹۷۸ء)

وہ کون سا مسلمان ہے جسے اس تصور سے خوشی نہ ہوگی کہ اسلام کے چہرہ پر جو بدنما دھبے لگا دیئے گئے ہیں، انہیں پاک اور صاف کر کے، اسلام کو اس کی پاکیزہ شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس اعتبار سے چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کی یہ تجویز دلوں میں بڑی خوش فہمیاں پیدا کرنے کی موجب ہے۔

لیکن اس تجویز کو اگر خوش کن جذباتیت سے ہٹ کر، واقعیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کون سا اسلام ہے جسے آپ غیر ممالک میں پیش کریں گے؟ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ (مثلاً) اگر ایک غیر مسلم کسی اہلِ حدیث کے ہاتھ پر اسلام لاتا ہے تو وہ دوسرے ہی دن اہلِ حدیث کے خلاف کفر کا فتویٰ سن لیتا ہے۔ اگر وہ کسی دیوبندی مبلغ کے ہاتھ پر اسلام لاتا ہے تو بریلوی حضرات اسے اپنی مسجد میں گھسنے نہیں دیتے اور کافر کہہ کر باہر نکال دیتے ہیں — وہ بیچارہ حیران رہ جاتا ہے کہ کفر سے بچنے کے لئے اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ اگر اسلام لانے کے بعد بھی وہ کافر کا کافر ہی رہا، تو اس کے پہلے کفر میں کیا خرابی تھی۔ اس وقت وہ کم از کم اپنے سابقہ اہلِ مذہب کی برادری میں تو شامل تھا۔ سوال یہ ہے کہ آپ کس عقیدہ کے مبلغ باہر بھیجیں گے اور وہ جن لوگوں کو اپنے عقاید کے مطابق مسلمان کریں گے، انہیں، ان عقاید کے مخالف علماء کیا قرار دینگے؟

پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ اسلام پیش کرنے جائیں گے مغربی ممالک میں جہاں حریتِ عقل و فکر کی روسے تسلیم کی جاتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر آپ کے کسی مبلغ نے وہاں کوئی ایسی بات کہہ دی جو عقل و فکر کے معیار پر تو پوری اترے لیکن آپ کے ہاں کے قدامت پرست علماء کے عقیدہ کے خلاف ہو، تو اس مبلغ (اور اس کے ساتھ ہی اس نومسلم) کو پاکستان میں واپس آنے کی اجازت بھی مل سکے گی؟ اور پھر اس باب میں خود حکومت کا موقف کیا ہوگا؟ اس وقت آپ کے ہاں اندرونِ ملک میں یہ حالت ہے کہ اختلافِ عقیدہ اور مسلک کی بنا پر ہر روز سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ نوبت قتل تک پہنچ جاتی ہے۔ مسجدوں میں تالے پڑ جاتے ہیں۔ پولیس کو مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ مقدمے بازی ہوتی ہے۔ انتظامیہ کو ضرورت لاحق ہو جاتی ہے کہ کسی واعظ کو ضلع بدر کر دیا جائے، کسی کی زبان بندی کر دی جائے۔ قوم کا بیشتر وقت، دولت، توانائی، اسی خلفشار کی نذر ہو جاتا ہے۔ حکومت اگر کوئی اصلاحی قدم اٹھاتی ہے تو مذہب کے نام پر اس کے خلاف شورشیں برپا کر دی جاتی ہیں۔ اپنے گھر کے اندر تو آپ کی یہ حالت ہے اور آپ ارادے باندھ رہے ہیں یورپ، امریکہ، روس اور چین کو مسلمان کرنے کے! سچ کہا تھا سعدی نے کہ ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ بر آسماں نیز پرداختی

پھر اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ آپ کا مبلغ ان ممالک میں جا کر کچھ اسی قسم کی تبلیغ کرے گا نا، کہ۔

اسلام ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں دنیائے انسانیت کی تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ آج اقوامِ عالم جس جہنم میں مبتلا ہیں اس سے نکلنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظامِ زندگی ہے۔ اسی سے آدمی کو قامتِ انسانیت نصیب ہو سکتی ہے۔ اسی سے اسے اس دنیا کی سرفرازیاں اور سربلندیاں

حاصل ہو سکتی ہیں اور آخرت کی کامیابیاں اور کامرانیاں بھی۔

یہ کچھ سن کر اگر کسی نے وہاں یہ کہہ دیا کہ حضور! اگر آپ کے پاس اقوامِ عالم کے امراض کے لئے اس قدر عجیب و غریب نسخہ کیمیا موجود ہے تو آپ اسے پہلے اپنے ہاں استعمال کیوں نہیں کرتے؛ حالت تو آپ کی یہ ہے کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اسلام کا نام لینے والی کوئی قوم ایسی نہیں جو غیر مسلموں کی دست نگر نہ ہو، اور آپ انہی غیر مسلموں سے کہنے یہ آتے ہیں کہ اگر سرفرازیاں اور سربلندیاں چاہتے ہو تو اسلام قبول کر لو۔ پہلے اپنا علاج کیجئے۔ پھر ہماری طرف آیئے ـــــ تو اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہوگا؟

حضرت! کسی نظام کی طرف لوگ آتے ہیں اس کے محسوس نتائج کی کشش سے۔ جس اسلام کو آپ اس قدر پُرکشش سمجھتے ہیں، پہلے اسے اپنے ہاں رائج کر کے اس کے محسوس نتائج پیدا کیجئے۔ اگر ان نتائج سے دنیا نے دیکھ لیا کہ ان سے فی الواقع نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل مل سکتا ہے تو آپ کو کہیں مبلغ بھیجنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ دنیا خود بخود اس کی طرف کھنچی چلی آئے گی ـــــ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ـــــ اور اگر اس کے نتائج وہی ہیں جو اس وقت (بلکہ صدیوں سے) اسلامی ممالک میں سامنے آ رہے ہیں، تو (معاف فرمائیے) اس سے غیر مسلموں کا اس کی طرف کھنچ کر آنا تو ایک طرف، اگر آپ خود اپنے ہاں کی آنے والی نسلوں کو اس سے متمسک رکھ سکیں تو یہ بھی معجزہ ہوگا۔ جس شدت کے ساتھ یہاں اسلام کے نام پر قدامت پرستی اور مفاد پرستی زور پکڑ رہی ہے، اگر (خدا نخواستہ) کمیونزم کے ایک ہلکے سے جھکڑ نے بھی ادھر کا رخ کر لیا تو آپ دیکھیے گا کہ آپ کی یہ خوش فہمیاں کس طرح خس و خاشاک کی طرح نذرِ طوفان ہو جاتی ہیں! یاد رکھیے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر،
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

(بقیہ)

خصوصی رعایت

طلوع اسلام کنونشن کی تقریب پر جو ۱۰ ارتا ۱۳ اراکتوبر بمقام ۲۵/بی گلبرگ میں منعقد ہو رہی ہے، ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابوں پر خصوصی رعایت دی جائے گی۔ تفصیل کنونشن کے بک سٹال پر ملاحظہ فرمایئے۔

ناظم۔ ادارہ طلوع اسلام

علامہ تمنا عمادی مدظلہ العالی

ہماری تاریخ

علامہ ابن جریر طبریؒ

(۳)

سیف بن عمر سیف بن عمر سے روایاتی تعلق اگر کسی سری کو تھا تو وہ سری بن اسماعیل الکوفی ہی تھے۔ شعیب سیف بن عمر کے مستقل راوی اخبار تھے اور سری بن اسماعیل سیف بن عمر سے حدیثیں روایت کرتے تھے، جو ولادت ابن جریر سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ شعیب بن ابراہیم کا سال وفات ائمہ رجال نے لکھا نہیں ہے۔ سیف بن عمر کے بارے میں بھی اسی قدر لکھا ہے کہ زمانہ خلافت ہارون الرشید سیف نے وفات پائی۔ ہارون الرشید کی خلافت ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک رہی۔ انہی ۲۳ برس کے اندر کسی سال سیف بن عمر نے وفات پائی۔ تقریب میں جو ان کو گیارہویں طبقے کے محدثین میں شمار کیا جاتا ہے معلوم نہیں کس حساب سے؟ اس لئے کہ گیارہویں طبقے کے محدثین کی وفات عموماً چوتھی صدی کے نصف اول میں ہوتی ہے، اس لئے ہارون الرشید کی خلافت میں ان کی وفات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہارون الرشید کی خلافت میں سیف بن عمر کی ولادت بھی جاتی تو گیارہویں طبقے میں انکا شمار صحیح ہو سکتا تھا۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کے بارہ شیوخ لکھ کر ان کے اثنا عشری ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ جن میں سے ایک تو طلحہ بن اعلم ہیں، دوسرے بکر بن وائل جن کے سال وفات کا پتہ نہ مل سکا۔ باقی دس میں سے ابوالزبیر المکی متوفی ۱۲۶ھ ہیں اور عبداللہ بن عمر العمری متوفی ۱۷۱ھ یا ۱۷۲ھ ہیں۔ باقی آٹھ ان دونوں کے درمیان ہیں۔ ان دونوں کے درمیان پچاس برس کا فاصلہ ہے۔ اس سے اتنا پتہ ملتا ہے کہ سیف بن عمر نے عنفوان شباب میں ابوالزبیر سے حدیثیں سنی ہوں گی اور اواخر عمر میں عبداللہ بن عمر العمری سے یعنی تقریباً بیس اکیس برس کی عمر میں ابوالزبیر سے سنی ہوں اور تقریباً

ستر برس کی عمر تک عبداللہ العمری سے حدیثیں سنی ہوں، اور ان کی وفات کے بعد بھی چند سال زندہ رہے ہوں۔ تو ان کی یعنی سیف بن عمر کی ولادت ۱۱۰ھ کی، دو یا ایک برس کم یا بیش تصور کیجئے اور وفات ۱۳۰ھ میں تو ابوالزبیر اور عبداللہ العمری سے ان کی روایت بھی صحیح ٹھہرتی ہے اور ۱۸۰ھ میں ان کی وفات بزمانۂ خلافت ہارون الرشید بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

اور گیارہویں طبقے کا محدث یعنی ۲۰۰ھ یا اس کے بعد ان کی وفات تسلیم کرتے ہیں ان کی روایت ابوالزبیر المکی سے صحیح مانی نہیں جاسکے گی اس لئے کہ ابوالزبیر کی وفات ۱۲۶ھ میں ہے۔ اگر اسی سال ان سے سیف بن عمر کا حدیثیں سننا فرض کر لیجئے جب بھی سیف کی عمر لوٹنے دو سو برس کی ماننی ہوگی جو یقیناً غلط ہوگی۔ مختصر یہ کہ ۱۱۰ھ سے ۱۲۰ھ تک کے اندر سیف بن عمر کی ولادت اور ۱۸۰ھ سے لیکر ۱۹۲ھ تک کے اندر ان کی وفات تسلیم کی جائے تو کسی قسم کا اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ اب اس تخمین کی تعیین کو لیجئے کہ ۱۱۵ھ میں سیف بن عمر کی ولادت اور ۱۹۰ھ میں ان کی وفات سمجھ لی جائے تو یہ تخمینہ دیانت قبول کر سکتی ہے۔

شعیب بن ابراہیم

کے بارے میں تو ابن حجر نے اسی قدر لکھا ہے کہ یہ سیف بن عمر کے راوی تھے یعنی سیف کی من گھڑت روایتوں کو یہاں وہاں پھیلایا کرتے تھے۔ جو وہ بیان کیا کرتے تھے ان میں اسلاف پر حملے بھی ہوا کرتے تھے۔ مگر حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں (جلد اول ص ۴۴۷) لکھتے ہیں۔ روی سیف عنہ یعنی سیف ہی ان سے روایت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سیف ان سے حدیثیں روایت کرتے ہوں اور یہ سیف کی تاریخی روایتیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قریب العمر ہم سن ہوں گے۔ مگر شعیب کس محدث سے روایت کرتے تھے، اس کا ذکر نہیں، شعیب سے کون روایت کرتا تھا اس کا بھی مطلق ذکر نہیں۔ اگر سری بن یحییٰ التمیمی شعیب سے روایت کرتے تو کیا امام ذہبی اور ابن حجر اس کا ذکر نہ کرتے اور ابن عدی اور ابن حبان اس کو نہ لکھتے، یہ سب سمجھتے تھے کہ ابن جریر نے کوفے میں آکر کوئی کذابوں، وضاعوں اور رافضیوں سے سیف بن عمر وغیرہ کی گھڑی ہوئی روایتیں حاصل کیں اور یہ معلوم کر کے کہ سیف بن عمر کی روایتوں کے راوی شعیب بن ابراہیم تھے اور سیف کے ایک شاگرد سری بن اسماعیل بھی تھے۔ سری بن اسماعیل الکوفی کے بارے میں ابن جریر کو اتنا ہی کوفے میں معلوم ہوا کہ وہ مر چکے۔ سمجھے تھے کہ آٹھ دس برس ان کی موت کو ہوتے ہوں گے۔ پھر آکر جب تاریخ مرتب کرنے لگے کتب الی السری عن شعیب عن سیف لکھ لکھ کر روایتیں اپنی کتاب میں بھرنے لگے۔ بعد کو جب معلوم ہوا کہ سری بن اسماعیل تو ان کی ولادت سے پچاس ساٹھ برس قبل وفات پاچکے

تھے تو اسماعیل کے لفظ چھیل کر اس کی جگہ سری بن یحییٰ بنا دیا۔ سری بن یحییٰ محدث جن سے لوگ واقف تھے وہ بصرے کے رہنے والے تھے جن کو تاریخی روایات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور معلوم ہوا کہ وہ بھی ان کی ولادت سے پچاس برس سے بھی زیادہ قبل وفات پا چکے تھے تو اس نام کے بعد التمیمی کا لفظ بڑھا دیا یہ اگرچہ شعیب اور سیف سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، نہ تاریخ و سیرت سے کچھ دلچسپی رکھتے تھے، کوئی محدث بھی نہ تھے۔ کچھ حدیثیں ادھر اُدھر سے لے کر یا اپنے چچا هناد کے ذخیروں میں سے لے کر شیخ کا نام بدل کر اپنی طرف سے بلا طلب ابن ابی حاتم کے پاس انہوں نے بھیجدی تھیں۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی تعلق ان کو حدیثوں سے بھی کبھی نہیں رہا۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور پھر اپنی تاریخ میں بھی حدثنی السری بن یحییٰ التمیمی لکھ کر بعض اقوال ان کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔ ابن جریر کے سوا تو ان سے کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ غرض ابن جریر نے تو درحقیقت ان کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے یہ انتقال کر چکے ہوں گے۔ مگر سری بن اسماعیل کی جگہ ابن جریر نے کتب الی السری بن یحییٰ التمیمی اور حدثنی السری بن یحییٰ التمیمی عن شعیب عن سیف بن عمر اپنی تفسیر اور تاریخ میں لکھ مارا۔ اگرچہ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے سری بن یحییٰ التمیمی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

مختصر یہ کہ کسی سری نے بھی ابن جریر کو لکھ لکھ کر شعیب کی روایت سے سیف بن عمر ملحد کذاب کی من گھڑت تاریخی روایتیں نہیں بھیجی تھیں۔ ابن جریر کا یہ دعویٰ یقیناً جھوٹا ہے کہ سری بن یحییٰ التمیمی ان کو شعیب سے سن سن کر یا لے لے کر سیف بن عمر کے بیان کردہ "تاریخی" واقعات بھیجتے رہے تھے۔

محمد بن راشد السلمی سیف بن عمر محمد اور طلحہ دو راویوں سے روایت کرتے ہیں۔ مگر کبھی محمد بن راشد السلمی بقید ولدیت و نسبت بھی روایت کرتے ہیں۔ محمد بن راشد تو اسماء الرجال کی کتابوں میں بے شک بہت سے ملیں گے۔ صرف "محمد بن راشد" کی فہرست پیش کر دینا تو جاہلانہ خودنمائی یا جاہلوں کے لئے ابلہ فریبی ہے۔ جب محمد بن راشد السلمی کسی کتاب میں نہیں ملتا تو سیف کے شیخ ہوں یا نہ ہوں کتب رجال سے "محمد بن راشد" نام والوں کی فہرست پیش کر دینے کے باوجود سیف کا شیخ "محمد بن راشد السلمی" کو بتانے والا تو فی ضلال بعید ہی رہا۔

محمد بن نویرہ کہیں کہیں محمد بن نویرہ بھی ابن جریر لکھ مارتے ہیں۔ کتب رجال میں محمد بن نویرہ

کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ البتہ خود ابن جریر نے تاریخ کی جلد ۴ ص میں اس طرح ہر ہر راوی کا تعارف فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں۔ كتب الى السرى عن شعيب عن سيف عن محمد بن عبد الله بن سواد بن نويرة عن عزيز بن مكنف التميمي ثم الأسيدى وطلحة بن الاعلم الحنفى عن المغيرة بن عُتَيبة بن النهاس العجلى وزياد بن سرجس الاحمرى عن عبد الرحمٰن بن سابط الاحمرى۔ قالوا جميعًا قال اهل فارس لرستم والفيرزان وهما على اهل فارس اين يذهب بكما؟ لم يبرح بكما الاختلاف حتى وهنتما اهل فارس۔ واطمعتما فيهم عدوهم الخ۔ یعنی مجھ کو سری نے لکھا شعیب سے سن کر اس نے سیف سے اس نے محمد سے جو عبداللہ کا بیٹا وہ سواد کا بیٹا وہ نویرہ کا بیٹا تھا۔ اس محمد نے عزیز بن مکنف التمیمی سے جو پھر اُسیدی ہو گئے اُن سے سنا تھا اور سیف سے طلحہ بن الاعلم الحنفی نے بھی کہا مغیرہ بن عتیبہ بن النہاس العجلی سے سن کر اور سیف سے زیاد بن سرجس الاحمری نے بھی کہا۔ عبدالرحمٰن بن سابط الاحمری سے سن کر۔ ان سبھوں نے مل کر (بہ یک آواز سُر ملا کر) کہا کہ اہل فارس نے رستم اور فیرزان سے کہا درحالیکہ وہ دونوں اہل فارس پر (بادشاہ فارس کی طرف سے سربراہ مقرر کئے ہوئے تھے۔ تم دونوں کو کہاں سے جایا جا رہا ہے؟ تم دونوں کو اختلاف کبھی نہ چھوڑے گا یہاں تک کہ تم دونوں نے اہل فارس کو پست ہمت بنا دیا اور ان کے بارے میں طمع و امید تم دونوں نے بنا دیا اُن کے دشمن کو۔ الخ"۔

دیکھئے اہل فارس کے جذبات وطن پرستی کا ذکر کرنے کا موقع آیا تو ابن جریر جوش میں آ کر کس طرح ہر راوی کی ولدیت و نسبت سب کچھ بیان کر گئے، صرف باپ ہی نہیں دادا پردادا تک کے نام بتا گئے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ابن جریر تدلیس کی نیت سے راویوں کے ناموں کو مبہم رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ تعریف المجہول بالمجہول یا تعارف المجہول بالمجہول کر کے عام ناظرین کے ساتھ ابلہ فریبی ہی سے کام لیا ہے۔ جب امام کا یہ حال ہو تو مقتدی بھی یہی طریقہ کیوں نہ اختیار کریں۔ تلاش ہو محمد بن راشد السلمی کی مگر صرف محمد بن راشد یا بعض دوسری نسبتوں والوں کی فہرست پیش کر دی کہ تم کو محمد بن راشد ملے ہی نہیں ہیں؟ دیکھو اتنے محمد بن راشد کتابوں میں موجود ہیں حالانکہ جس کی تلاش ہے وہ محمد بن راشد السلمی کہیں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح عنہ محمد و طلحہ میں کون محمد مراد ہیں؟ اس کو متعین کر کے دکھا دینا چاہیے تھا۔

پنتہ محمد نام کے راوی مختلف ولدیتیں اور نسبتوں والوں کی فہرست پیش کر دینا کم علم ناظرین

کو دھوکا دینا ہے۔ اگر صرف ایک ولدیت ونسبت سے محمد تعین ودو ایک جگہ مذکور ہوتے اور باقی جگہوں میں صرف نام تو سمجھا جاتا وہی محمد جن کی ولدیت ونسبت فلاں جگہ مذکور ہے وہی ان جگہوں میں بھی مراد ہیں جہاں صرف نام ہے۔ فہرست تو پندرہ ولدیتوں کی پیش کی گئی۔ ان پندرہ میں سے کس کو متعین کیا جائے؟ جہاں صرف محمد ہے وہاں ان کو محمد بن مرزوق سمجھا جائے یا محمد بن نویرہ یا محمد بن راشد اسلمی یا اور کوئی۔ ان پندرہ میں سے وہاں سمجھے جائیں؟ — غرض ابن جریر نے اس تصریح میں جتنے نام بھی بتائے ہیں ان میں سے ایک نام بھی متعارف نہیں اور نہ رجال کی کسی کتاب میں کوئی نام طلحہ بن الاعلم اور عبدالرحمن کے سوا مل سکتا ہے۔ عبدالرحمٰن بھی ابن سابط کتاب میں نہیں ملے گا۔ "ابن سابط" اور "احمری" انہی کتابوں میں سے ہے۔ عبدالرحمٰن بن سابط کو جمحی لکھا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مبارک عہد میں ایرانیوں سے پہلے پہل جنگ چھڑی ہوئی تھی تو ایرانی فوجیوں نے اپنے سپہ سالار رستم اور فیرزان سے جو باتیں کی تھیں ان کا ذکر ہے۔ تو مجاہدینِ اسلام کو اس کی کیا خبر ہو سکتی تھی کہ وہاں ایرانی فوج میں کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ فتح ایران کے بعد جو قیدی ہاتھ آئے اور وہ پھر مسلمان ہو گئے ان سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہوں گی۔ ان قیدیوں کے نام اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلمانوں جیسے ہو گئے اور جس قبیلے میں وہ رہے اس قبیلے کی طرف منسوب ہو گئے۔ اُن کے ذریعات سے جو روایت ہوگی ان راویوں کے نام اسماء الرجال کی کتابوں میں کہاں سے ملینگے۔ اس لئے اگر ان میں سے کوئی نام بھی ہماری کتابوں میں نہ ملے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ راویانِ احادیث نہ تھے کہ ان کے نام کتبِ اسماء الرجال میں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

طلحہ بن الاعلم جن کی کنیت ابو الہیثم امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھی ہے اور لکھا ہے کہ شعبہ سے انہوں نے حدیثیں سنیں اور سفیان ثوری اُن سے روایت کرتے تھے اور مروان بن معاویہ بھی اور ابن ابی حاتم نے بھی طلحہ بن الاعلم ابو الہیثم الحنفی الکوفی سے ان کا تعارف کرایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ رے میں نازل ہو گئے تھے۔ شعبی سے حدیثیں سنی تھیں۔ ثوری، جریر اور مروان بن معاویہ نے ان سے حدیثیں سنی تھیں۔ ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا فرمایا کہ شیخ[1] - ایک شیخ ہیں۔

میرے پاس امام بخاری کی تاریخ کبیر اور ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل نہیں ہے۔ اس لئے مجھ کو یہ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ تہذیب التہذیب میں مصنفین صحاح ستہ کے راویوں کا ذکر ہے۔ مگر تمیز کے لئے اور

---

[1] یہ کلمہ تحقیر کا ہے، یعنی ایک معمولی سے شیخ ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں۔ "

ضمناً دوسرے راویوں کا ذکر بھی اس میں کیا ہے۔ میزان الاعتدال و لسان المیزان، تذکرۃ الحفاظ، تعجیل المنفعۃ، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال، انساب سمعانی اور امام بخاری کی تاریخ صغیر یہ کتابیں میرے پاس ہیں۔ طبقات ابن سعد بھی میرے پاس نہیں ہے۔ مگر جتنی کتابیں میرے پاس ہیں۔ ان میں طلحہ بن الاعلم کا ترجمہ نہیں ہے۔ تاریخ کبیر و کتاب الجرح والتعدیل سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے اب اس پر غور کرنا ہے۔ طلحہ بن الاعلم الکوفی فقط شعبہ بن الحجاج الواسطی ثم البصری سے ہی روایت کرتے ہیں۔ خود کوفی تھے کوفے کے کسی محدث سے روایت نہیں کرتے۔ رَے پہنچ گئے تھے تو کسی رازی سے روایت نہیں کرتے۔ آخر کیوں؟ شعبہ کی ولادت ۸۲ھ میں اور وفات ۱۶۰ھ میں ہوئی تھی۔ ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں (ج ۴، ص ۳۴۵) کوفے میں اس وقت تو ابو اسحٰق السبیعی اور سلیمان الاعمش جیسے محدثین شعبہ بن الحجاج کی ٹکر کے موجود تھے۔ کوفی ہو کر کوفے کے محدثین کو چھوڑ کر بصرہ پہنچ گئے اور وہاں بھی صرف شعبہ ہی کو منتخب کیا۔ پھر رَے کیا پہنچے تھے؟ اُس وقت رَے کا میدان خالی تھا۔ کوئی اور بڑا محدث وہاں ایسا نہ تھا جس سے تحصیل علم کرتے اگر وہاں اشاعتِ علم کے لئے گئے تھے تو وہاں کس کو محدث بنایا؟ جریر بن عبد الحمید تو انہیں کی طرح کوفی تھے اور انہی کی طرح کوفے سے ہی رَے گئے تھے۔ عجب کیا ہے کہ دونوں ساتھ گئے ہوں۔ جریر ان سے زیادہ بڑے محدث تھے۔ ان کے اساتذہ بھی ان سے زیادہ اور تلامذہ بھی ان سے زیادہ۔ ممکن ہے کہ ایک ہم سفر "علم" کہہ کر ان سے بھی دو ایک حدیثیں لے لی ہوں۔ ۱۸۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

مروان بن معاویہ کوفی ہی تھے۔ ۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ راہ چلتوں سے پکڑ پکڑ کر حدیث لیا کرتے تھے۔ ان سے بھی لے لی ہوگی۔ اسی لئے ائمہ رجال نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ معروف و مشہور لوگوں سے جو روایت یہ کریں ان میں ثقہ ہیں اور مجہول وغیر معروف لوگوں سے جو روایت کریں اس میں ضعیف ہیں۔ سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ تو ہر کس و ناکس سے حدیثیں لینے کے خوگر تھے۔ جابر جعفی جیسے مشہور کذاب رافضی سے بھی حدیثیں سُنی تھیں۔ جابر ہی کے ترجمے میں تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۵۰ میں لکھا ہے التوری لیس عن مذھبہ ترک الروایۃ عن الضعفاء۔ ثوری کے مذہب میں ضعیف راویوں سے روایت کر دینا نہیں ہے۔ تو جب جابر جعفی سے وہ روایت کرتے ہیں تو طلحہ بن الاعلم جیسے مجہول الحال سے بھی روایت کریں تو کیا تعجب ہے۔ اور طلحہ کے لئے کون سی فخر کی بات ہے۔

مگر نہ امام بخاری نے تاریخ میں لکھا کہ طلحہ بن الاعلم سے سیف بن عمر روایت کرتے تھے۔ نہ ابن ابی حاتم نے لکھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ طلحہ بن الاعلم کوئی دوسرے ہوں جن سے ثوری، جریر بن عبد الحمید اور مروان معاویہ روایت کرتے تھے اور جو خود شعبہ سے روایت کرتے تھے۔ اور سیف کے شیخ کوئی دوسرے گمنام مفقود الخبر

ہوں جس طرح کہہ دیا گیا کہ وہ سعید بن ربیع جن سے ابن جریر روایت کرتے ہیں وہ دوسرے ہیں۔ وہ سعید بن الربیع الرازی ہیں، اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ جن سے سیف بن عمر روایت کرتے ہیں وہ طلحہ بن الاعلم البصری ہیں اور ثوری وغیرہ نے جن سے حدیث سنی تھی وہ طلحہ بن الاعلم الکوفی تھے۔ یہ صرف ایک معارضہ بالمثل نہیں ہے بلکہ قرینۂ واضحہ میرے اس معارضے کی واقعیت کا پتہ دے رہا ہے۔ بنظر انصاف دیکھئے جب دونوں میں سے کسی نے بھی ان طلحہ بن الاعلم کو سیف بن عمر کا شیخ نہیں لکھا ہے تو یقیناً یہ طلحہ بن الاعلم جن کا ذکر امام بخاری نے تاریخ کبیر میں اور ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں کیا ہے، جو شعبہ متوفی ۱۶۰ھ کے شاگرد تھے، غالباً ۱۲۰ھ یا اس سے کچھ قبل یا بعد جن کی وفات ہوگی، وہ طلحہ بن الاعلم سیف بن عمر کے شیخ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ سیف بن عمر کے شیخ جو طلحہ بن الاعلم تھے وہ ماہان سے روایت[1] کرتے تھے۔ اور ماہان کو حجاج نے ۸۳ھ میں قتل کیا تھا۔ ماہان سے روایت کرنے والے کی عمر ۸۳ھ میں کم سے کم تیس[2] برس کی تو ہونی چاہیے جس سے کہنے والا واقعات بیان کر سکے۔ تو ماہان سے روایت کرنے والے طلحہ کی ولادت ۵۳ھ میں کم و بیش ہونی چاہیے اور شعبہ بن الحجاج کی ولادت ۸۲ھ کی تھی جبکہ طلحہ بن الاعلم سیف بن عمر کے شیخ ۱۹، ۲۰ برس کے ہوں گے۔ شعبہ کو ان سے روایت کرنا تھی نہ کہ وہ شعبہ سے روایت کرتے۔ ماہان متوفی ۸۳ھ سے تاریخی واقعات سننے والے سے جریر بن عبدالحمید متولد ۱۱۰ھ کا روایتیں سننا ضرور مستبعد ہے۔ اس لئے یقیناً سیف بن عمر والے طلحہ بن الاعلم وہ نہیں ہیں جس کا ذکر امام بخاری نے اور ابن ابی حاتم نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ اگر وہی ہوتے تو ثوری و جریر و مروان بن معاویہ کے ساتھ سیف بن عمر کا نام بھی دونوں نہیں تو دو میں سے ایک ضرور لکھتا۔

عمر بن شبّہ

جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہو، قیامت کی بازپرس کا خوف نہ ہو، وہ دیانت سے کبھی کام نہیں لے سکتا۔ وہ ہمیشہ جذبات سے کام لیتا ہے۔ معترض نے تہذیب التہذیب کے حوالے اپنے تعاقب میں دیئے ہیں جس طرح تقریب و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں عمر بن شبّہ کا ترجمہ دیکھا اسی طرح ضرور تہذیب التہذیب میں بھی عمر بن شبّہ کا ترجمہ دیکھا ہوگا۔ اور اس

---

[1] تاریخ طبری جلد چہارم ص۸۵ مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ۔ الطبعۃ الاولیٰ۔ ۱۲

[2] حدیثیں سننے کے لئے زیادہ عمر کی ضرورت نہیں مگر تاریخی واقعے کم سنوں سے کوئی کیا بیان کرے گا۔ اس کے لئے پختہ سن والے مخاطب ہوتے ہیں۔ ۱۲

میں ہندسے میں نہیں لفظوں میں صاف طور سے چھپا ہوا دیکھا ہوگا۔ مات فی جمادی الآخرۃ سنۃ اثنتین ومأتین وکان قد جاوز التسعین۔ یعنی ماہ جمادی الاُخریٰ سن دو سو دو میں وفات پائی اور نوّے سے تجاوز کر گئے تھے۔ یعنی کچھ دن یا کچھ مہینے۔ ورنہ سنہ بدل جاتا۔ یہ دیکھ کر بھی مجھ پر کذب و افترا کا بہتان باندھنا اور اپنے ..... امام کی تقلید میں سب و شتم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا، کیا کسی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے کا شیوہ ہو سکتا ہے؟ انسان کسی مضمون کو ایک کتاب میں دیکھ لینے کے بعد سمجھ لیتا ہے کہ اور کتابوں میں بھی یہی ہوگا۔ میں نے تہذیب التہذیب پر اعتماد کیا اور دوسری کتابیں ضعفِ بصارت کی وجہ سے نہیں دیکھیں۔ مجھ کو شبہ صرف سال ولادت دیکھ کر ہوا تھا۔ اسی صفحے میں سال ولادت (۷۳) لکھا ہے۔ میں گھبرایا کہ ۷۳ھ میں ولادت ہوئی اور نوّے برس کی عمر پائی تو وفات ۱۶۳ھ میں ہونی چاہیے اور یہاں وفات ۲۰۲ھ میں لکھی ہے۔ تو ذہن میں یہ آیا کہ (۱۱) کے جو دو الف ہیں، ممکن ہے کہ قلمی منقول عنہ نسخے میں دونوں الف کی ٹانگیں کتابت میں مل گئی ہوں اور اس کی صورت (۷) سات کی ہو گئی ہو۔ اس لئے طباعت میں (۱۱۳) کی جگہ (۷۳) چھپ گیا۔ نوّے برس کی عمر پائی تھی۔ ۱۱۳ میں ۹۰ ملا دینے سے ۲۰۳ ہو جاتے ہیں۔ مہینوں کے فرق کی وجہ سے وفات ۲۰۳ھ میں نہیں ۲۰۲ھ میں واقع ہوئی۔ چنانچہ اپنی کتاب کے حاشیے پر یہ مضمون لکھ بھی دیا۔ اس کا مطلق خیال نہ رہا کہ ابن حجر عموماً ہندسہ لکھنے میں سیکڑے کو چھوڑ دیتے ہیں، خصوصاً اگر سیکڑا ایک ہی ہو (۱۷۳) کی جگہ انہوں نے صرف (۷۳) لکھ دیا ہے۔ یہ غلط فہمی تو سال ولادت کا پورا ہندسہ کتاب میں چھپا ہوا نہ ہونے کے باعث ہوئی۔ مگر سال وفات تو صاف لفظوں میں تھا۔ اسکے بارے میں کوئی شبہ کیوں ہوتا؟ اگر تعاقب کرنے والے میں دیانت ہوتی تو وہ لکھتے کہ تہذیب التہذیب میں سال وفات غلط چھپا ہے، جس سے تم غلطی میں پڑے۔ دیکھو فلاں فلاں کتابوں میں تو عمر بن شبہ کا سال وفات ۲۶۲ھ صاف لکھا ہے۔ فصبرٌ جمیلٌ واللہ المستعان۔

نصر بن مزاحم اور ابو مخنف

مجھ کو اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے کہ حدثنا عن نصر بن مزاحم اور حدثنا عن ابی مخنف کو ضعفِ بصارت کی وجہ سے میں نے حدثنا پڑھ لیا اور عن کا خیال نہ کیا یا اس پر نظر نہ پڑی۔ اس لئے یہ گرفت بہت صحیح گرفت ہے۔ ؎

خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا
بتا دیا مجھے نیچ نیچ کے راستہ چلنا،

اس لئے نظر کی اس چوک سے متنبہ کر دینے کا شکر گزار ہوں۔

تدلیس کا مقصد تدلیس کے مقصد کو تو اہل تدلیس ہی جانتے ہیں کہ ان کو عملی تجربہ ہو سکتا ہے۔ مدرّس اور مدلّس میں ایک ہی حرف کا تو فرق ہے ع بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود، بس است۔ اور ابن جریر تو امام المدلّسین تھے۔

ضعفِ بصارت و ضعفِ بصیرت ضعفِ بصارت تو جس کو ہو وہی نہیں محسوس کرتا ہے، دوسرے دیکھنے والے بھی اس کی اداؤں کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس کو کم معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ کبھی اپنے ضعفِ بصارت کا انکار کر کے دوسرے لوگوں پر ضعفِ بصارت کا الزام نہیں عاید کرتا۔ مگر ضعفِ بصیرت والا اپنے آپ کو ضعیف البصیرت کبھی نہیں سمجھتا۔ ہمیشہ اپنے کو قویّ البصیرت ہی سمجھتا ہے اور دوسروں ہی کو ضعیف البصیرۃ قرار دیتا ہے۔ اسکا اصل فیصلہ تو مرنے کے بعد ہی ہوگا۔ من مات فقد قامت قیامتہٗ حدیثِ نبوی ہے صلے اللہ علیہ وسلم لیکن اہل دیانت اعمال و مواطف اور مساعی و مواقف کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں۔ ایک ایسی کتاب جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق پر خلفائے راشدین، امہات المؤمنین، مہاجرین و انصار، اور عام صحابہ کے اخلاقِ حسنہ پر چھپے چھپے حملے ہوں۔ اکابر صحابہ کو آج کل کے سیاستدانوں کی طرح ہوا پرست خودغرض، جاہ طلب، اور اقتدار پسند ثابت کیا گیا ہو، محض جھوٹی جھوٹی روایتوں کے ذریعے۔ اب ایک شخص اپنی غیرت ایمانی کے جذبے کے ماتحت ذبًّا عن النبي صلى الله عليه وسلم وعن اهل بيته واصحابه رضی اللہ عنہم اس کتاب کے کذب و افترا سے دنیا کو باخبر کر دینا چاہتا ہے۔ دوسرا شخص روایت پرستی و رُوات پرستی کے جذبے کے ماتحت اس کتاب کی ہر روایت کو صحیح ثابت کرنے اور اس کے راویوں کو ثقہ، اس کے مصنف کو امام قرار دینے پر تلا ہوا ہے۔ ان دونوں میں سے ایمانی بصیرت رکھنے والا کون ہے؟ ہر سچا مسلمان بہ آسانی سمجھ سکتا ہے اور دونوں فریق خود اپنے دل میں سوچیں کہ اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ؟

جہالت و اجہلیت مجھ کو اپنی جہالت بلکہ اجہلیت کا اعتراف ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً۔ جب تھوڑا ہی علم ملا ہے تو یقیناً جہالت بہت زیادہ ہے مگر الحمد للہ علیٰ احسانہٖ کہ میں جہلِ مرکب میں مبتلا نہیں ہوں۔ اللہ تعالےٰ نے مجھ کو جہلِ مرکب کے ہٹ دھرمی سے رُوات پرستی سے اور کورانہ تقلید سے محفوظ رکھا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک!

(باقی آئندہ)

خورشید عالم

روس امریکہ کا عالمی کردار

پچھلے سال اسرائیل کی برق رفتار جارحیت کے بعد روسی وزیراعظم کوسیگن جنرل اسمبلی (اقوامِ متحدہ) کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے نیویارک گئے تو روس اور امریکہ میں کشیدگی کی نئی صورتِ حال کے باوجود ان کی اور صدر جانسن کی ملاقات کا اہتمام ہو گیا۔ اس ملاقات میں اسرائیلی جارحیت اور اس کے نتائج کے بارے میں دونوں سربراہوں کے مابین جو باتیں ہوئیں سو ہوئیں، لندن کے اخبار "سنڈے ٹائمز" کے مطابق اس میں صدر جانسن نے وزیراعظم کوسیگن کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ روس اور امریکہ باہمی سمجھوتے سے کرۂ ارض کو آپس میں تقسیم کر لیں۔ وسائل، قوت اور ذہنیت کے اعتبار سے دونوں ممالک زمین کی وراثت کی تقسیم کی بات کر سکتے ہیں۔ یہ ان کی شرافت ہو گی کہ وہ یہ تقسیم صلح و صفائی سے کریں۔ ان کی طاقت اور طاقت کے تقاضے مسلّم لیکن انسانوں کے آخری فیصلے طاقت نے نہ پہلے کئے ہیں، نہ آئندہ کر سکے گی۔ قوت کی تدبیر پر تقدیر جیسے خندہ زن رہی ہے اسی طرح خندہ زن رہے گی۔ فرعون آئے اور چلے گئے، نمرود آئے اور چلے گئے۔ جانسن بھی آ کے چلے ہی جائیں گے۔ یہ زمین اسی طرح رہے گی اور گردشِ لیل و نہار سے تیار ہوتی جائے گی ان عبادی الصالحون کے ظہور کے لئے جو انسانی اقدار کے مظہر اور محافظ ہیں لہٰذا وراثتِ ارضی کے مستحق ہوں گے۔

صدر جانسن کی دعوتِ تقسیم ایک طرف نشۂ قوت کا پرتو ہے تو دوسری طرف اعترافِ عجز کا عکس بھی ہے۔ شیطنت نے اس طرح ایک کو دوسرے کے درپے کر دیا ہے کہ عجز قوت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ جیسا کہ ان صفحات میں وضاحت اور تکرار سے بیان ہو چکا ہے، دوسری جنگِ عظیم کے بطن سے امریکہ واحد ایٹمی طاقت کے طور پر ابھرا۔ بات قوت کی ہوتی تو اقوامِ عالم اس کے سامنے سجدۂ تعظیم بجا لاتیں اور وہ کرۂ ارض کا بلا شرکتِ غیرے مالک بن جاتا۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک وہ اسی حیثیت اور درجے کا مالک رہا۔ ان چار سالوں میں اس نے پہلو بدل بدل کر عالمی تنزانی روا رکھی۔ لیکن ایٹمی بموں کا خطرہ دھڑے کا دھڑا رہ گیا۔ وہ اپنی قوت کا جنازہ اٹھائے اٹھائے پھرتا رہا اور فضا سے انسانیت کو متعفن کرتا رہا۔ نہ وہ سبکدوش ہوا نہ انسانیت کا مشامِ جاں اس تعفن سے نجات پا سکا۔ روس ایٹم بم بنا کے امریکہ کے پہلو میں کھڑا ہونے لگا تو دونوں میں دھڑا دھڑ پاگلوں کا سا مقابلہ شروع ہو گیا۔ روس کی کوشش دوڑ کر امریکہ کو جا لینے کی تھی اور امریکہ کی کوشش تیز تر ہو کر آگے نکل جانے اور آگے رہنے کی تھی۔ روس کی غیر معمولی ترقی پر امریکہ کو جو تشویش قدرتی طور پر ہوئی اسے وہ یہ کہہ کے دباتا اور چھپاتا رہا کہ روس اس سے پیچھے ہے اور پیچھے ہی رہے گا۔ اس نے اس تجویز پر کان دھرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ایٹمی پاگل پن کا کچھ نہ کچھ تدارک ہونا چاہیے۔ ایک سابق سیکرٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلس کے الفاظ میں امریکہ گفتگو کے لئے تیار ہو کر روس کی عزت افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ذہنیت بڑی دیر تک قائم رہی۔ آئی ذلینر نے اقوامِ عالم کے سامنے یہ فاعدلیہ

رکھا کہ جو قوم امریکہ کے ساتھ نہیں وہ امریکہ کی دشمن ہے۔ امریکہ اور روس میں غیر جانبداری ان کے نزدیک بداخلاقی تھی۔ امریکہ نے دوسری قوموں کو' لالچ، رعب اور خوف سے اپنے ساتھ ملایا اور روس کے خلاف کیا۔ انگلستان سے جاپان تک اس نے روس کے خلاف عسکری تنظیموں اور فوجی اڈوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔

کم و بیش ۱۹۷۰ء تک امریکہ کی سیاست کا محور روس سے نفرت رہا۔ اس سال تک روس خلا تک پہنچ چکا تھا گویا ایٹمی ذخیرہ اندوزی میں روس پیچھے بھی رہ گیا تھا تو خلا تک پہنچنے میں وہ امریکہ سے نمایاں طور پر سبقت لے گیا۔ روس کی اس فقید المثال کامیابی سے امریکہ کو یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ خفیہ طور پر روس نے جو ترقی کر لی ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے سے وہ قاصر رہ گیا ہے۔ اس سے امریکہ کے اس اعتماد کو بجا طور پر صدمہ پہنچا کہ وہ روس سے آگے ہے۔ چنانچہ امریکہ کے دل میں روس کا خوف بھی پیدا ہونے لگا اور احترام بھی۔ امریکہ نے روس کے تتبع میں خلا میں قدم رکھ ہی لیا اور بعض کرتب بھی کر دکھائے لیکن خلا کے معاملے میں کم از کم وہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ روس سے آگے تو کیا اس کے دوش بدوش بھی ہے۔ خلا میں تو روس امریکہ پر سبقت لے گیا لیکن دوسرے شعبوں میں بھی کچھ ایسا پیچھے نہیں رہا۔ اس نے بڑی تعداد میں اور وسیع پیمانے پر ایٹمی تجربے کر کے ایٹمی تباہ کار آلات کا انبار لگا لیا۔ وہ بین البراعظمی میزائل بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ بحریہ پر پہلے اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ اب اس کے جہاز دنیا بھر کے سمندروں میں موجود ہیں اور وہ ایٹمی آلات سے بھی مسلح ہیں۔ گو امریکہ کے نقیب اب بھی بعض اوقات یہ کہنے پر اتر آتے ہیں کہ ایٹمی آلات میں روس ان سے پیچھے ہے اور یہ حقیقت بھی ہو سکتی ہے' تاہم اب سوال یہ باکل نہیں رہا کہ کون کس سے پیچھے ہے اور کس قدر۔ دونوں نے اس قدر سامانِ ہلاکت جمع کر لیا ہے کہ وہ آگے پیچھے ہونے کے باوجود اس قدر قوی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی تہذیب اور ہستی ختم کر سکتے ہیں۔ اب اس کی بھی گنجائش نہیں رہی کہ ایک اچانک حملہ کر کے دوسرے کو بے خبری میں آ لے اور فتح یاب ہو۔ فتح و شکست کا تصور ختم ہو چکا ہے۔ ایٹمی جنگ کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ فریقین نیست و نابود ہو جائیں گے۔ فریقین سے یہاں مراد روس اور امریکہ جیسے دو فریق بھی ہیں اور پوری دنیا کے انسانیت بھی۔

ایک دوسرے کی طاقت کے اندازے اور اس احساس سے کہ یہ طاقت کس قدر ہمہ گیر اور مکمل تباہی کی حامل ہے' دونوں کے دلوں میں باہمی خوف پیدا ہو گیا ہے۔ جہاں امریکہ کو یہ یقین ہے کہ وہ روس کو نیست و نابود کر سکتا ہے وہاں اسے یہ بھی یقین ہے کہ روس بھی اسے اسی طرح نیست و نابود کر سکتا ہے' اور اگر ایٹمی جنگ شروع ہو گئی تو دونوں ہی ایک دوسرے کو تباہ کر دیں گے اور کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ اس ڈر نے دونوں کو مجبور سا کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہوئے بھی وہ کسی موقع پر بھی اور کسی وجہ سے بھی اس قدر اشتعال میں نہ آئیں کہ آپس میں دست و گریباں ہو جائیں اور ایٹمی جنگ شروع کر دیں۔ اب اگر دونوں میں جنگ چھڑے تو وہ ایٹمی ہو گی اور دونوں کی تباہی کا موجب۔ ایٹمی آلات سے پہلے روس اور امریکہ میں مسلح امن کی فضا تھی۔ ایٹمی قوت کی دریافت کے بعد وہ اس حد تک مسلح ہو گئے ہیں کہ مسلح امن کی فضا باہمی خوف میں تبدیل ہو گئی ہے۔ باہمی خوف نے روس اور امریکہ کے مابین براہِ راست جنگ کو ناممکن سا بنا دیا ہے۔

خوف کے عنصر میں آہستہ آہستہ معاشی عنصر کا بھی اضافہ ہو گیا۔ زمانہ قبل از ایٹم میں جنگی تیاریوں کا معاشی بوجھ کم کمر شکن نہیں تھا لیکن ایٹمی تیاری نے تو اس بوجھ میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ روس اور امریکہ جو کچھ خلا میں' فضا میں'

زیر زمین اور زیر آب کرنے لگے ہیں' یا کرنے پر مجبور ہیں' وہ ان کی معیشت پر بُری طرح اثر انداز ہونے لگا ہے۔ یہی حال رہا تو ان کا نظم معاشی درہم برہم ہو کے رہے گا۔ باہمی خوف اور معاشی مشکل کے پیش نظر دونوں اس طرح کی باتیں کرنے پر آ گئے ہیں کہ جیو اور جینے دو کے اصول کا دم بھرتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنے اپنے حال پر رہنے دیں۔ دونوں اپنی اپنی صوابدید کے مطابق معاشی ترقی اور معاشرتی بہبود پر توجہ دیں اور یوں عملی طور پر اپنے اپنے نظام کی برتری ثابت کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلحہ کی دوڑ کی رفتار بتدریج کم کرتے جائیں تاکہ معاشی اور معاشرتی بہبود کے منصوبوں کے لئے وسائل مہیا ہو سکیں۔ اس نئے تعلق کو بقائے باہم کا نام دیا گیا ہے اور اس کے بعض نظر فریب مظاہر دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ روس شروع سے ہی یہ مطالبہ کرتا چلا آیا ہے کہ ایٹمی آلات کی پیداوار روک دی جائے، ان کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے اور انہیں تلف کرنے کا انتظام کیا جائے۔ امریکہ کا ردِ عمل مسلسل خندۂ استہزا کا رہا ہے۔ وہ وہ اسی مفروضے پر قائم رہا ہے کہ روس اس سے پیچھے ہونے کی وجہ سے اس کوشش میں ہے کہ اس کی رفتار روک نہ دے تو کم ضرور کر دے۔ ایٹمی اسلحہ کی ممانعت اور تخفیف کی روسی تجاویز کو امریکہ نے کبھی مخلصانہ نہیں سمجھا اور بہ لطائف الحیل انہیں ٹالتا رہا۔ اب اس کا ردِ عمل حقیقت پسندانہ ہو گیا ہے۔ اس کی بقا کا تقاضا یہ ہے کہ روس سے مفاہمت کرے اور کوئی ایسا لائحہ العمل اختیار کرے جس سے ایٹمی اسلحہ کی دوڑ اس کے لئے قابلِ برداشت ہو جائے اور اس کا امکان کم سے کم ہو جائے کہ روس اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف ایٹمی اسلحہ استعمال کرنے لگیں۔

اس بدلتے ہوئے پس منظر کا نتیجہ ہے کہ روس اور امریکہ میں بعض ایسے معاملات طے پا چکے ہیں جنہیں بظاہر خوش آیند کہا جا سکتا ہے۔ ایک معاہدے کی رو سے صرف زمینی دوڑ میں ایٹمی تجربوں کی گنجائش رکھی گئی ہے' باقی ممنوع قرار دے دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح حال ہی میں انہوں نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ ایٹمی آلات کے پھیلاؤ کو روکیں گے۔ یعنی غیر ایٹمی ممالک کو نہ تو ایٹمی اسلحہ دیں گے اور نہ ان کی ایسی امداد کریں گے جس سے وہ ایٹمی اسلحہ خود بنانے کے قابل ہو جائیں۔ ان معاہدوں کو نقطۂ آغاز قرار دیا گیا ہے اور ان سے بڑی توقعات وابستہ کی جانے لگی ہیں۔ چنانچہ بقائے باہم اور مسابقت کی باتیں عام ہونے لگی ہیں اور یہ تاثر دیا جانے لگا ہے کہ روس اور امریکہ حلیف بن سکے ہوں یا نہیں' حریف نہیں رہے اور ایک دوسرے کے ایسے قریب آتے جا رہے ہیں کہ ان کے حلیف بن جانے کی آس لگائی جا سکتی ہے۔ آثار میں خوش فہمی کی واقعی گنجائش ہے لیکن جیسا کہ لکھا جا چکا ہے' روس اور امریکہ خلوص سے نہیں خوف کی وجہ سے ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہو رہے وہ ایک دوسرے کے قریب آتے دکھائی دے رہے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ان کے دل مل گئے ہیں۔ ان کے دل اسی طرح پھٹے ہوتے ہیں اور وہ بدستور ایک دوسرے کے اعداء ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو لپٹتے ہیں تو بجلی کے ڈر سے۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ گھٹا برستی ہے تو برستی رہے۔ بجلی کڑکی ہے تو کڑکتی رہے تاکہ روس اس سے لپٹا رہے۔ لیکن نہ گھٹا برستی رہ سکتی ہے' نہ بجلی کڑکتی رہ سکتی ہے۔

روس اور امریکہ کے مابین بقائے باہم کی جو فضا ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ روس کی حیران کن ایٹمی ترقی سے پیدا ہوئی' اسے چین اور روس کی باہمی مناقشت نے مزید تقویت دی۔ چین اور روس اشتراکیت کے مشترک علمبردار اور یک جان و دو قالب تھے۔ دونوں نے بالواسطہ امریکہ کو شکست دے کر چین سے بے دخل کیا تھا۔ اشتراکی ہو جانے کے بعد چین کی ہمہ جہتی ترقی کو روس کا مرہونِ منت سمجھا جاتا تھا۔ ان دو دیو قامت اشتراکیوں میں کشیدگی یہاں تک بڑھی کہ ۱۹۶۰ء میں روس نے

چین کی امداد سے یکسر ہاتھ روک لیا۔ اس کے بعد چین نے ایسی جداگانہ راہ اختیار کی جو روس کی مخالف سمت میں جاتی تھی۔ اس کشیدگی میں امریکہ نے اپنے لئے امید کی نئی کرن دیکھی۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس نے روس سے مراسم بڑھانے شروع کر دیئے۔ اس کا خیال تھا اور بہت حد تک قابلِ فہم، کہ اس طرح ایک طرف یورپ میں وہ روس کی طرف سے کسی حد تک مطمئن ہو جائے گا۔ دوسرے اپنا زیادہ سے زیادہ زور چین کے خلاف صرف کر سکے گا۔ اور اس کے لئے کوشاں ہو سکے گا کہ اس کی خلاف چین سرگرمیوں میں روس اس کا ساتھ دے۔ روس اور چین میں اختلافات وقت سے بڑھتے ہی گئے۔ ان میں ایسے سرحدی تنازعات ہیں جو کسی وقت تصادم کا باعث بن سکتے ہیں۔ چنانچہ سرحدوں پر وہ قریباً ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ گو کام بردباری سے لے رہے ہیں یا کشیدگی کا زیادہ چرچا نہیں کر رہے۔ اس کے علاوہ ان میں ایسے شدید تصوراتی اختلافات ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو اشتراکی کہنے کے روادار نہیں۔ اس کشیدگی کا امریکہ فائدہ اٹھا تو سکتا ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ امریکہ اور روس بقائے باہم کا جس قدر چاہیں چرچا کریں، وہ چین کی دشمنی کو جس حد تک چاہیں وجۂ اشتراک بنائیں، صورت حال ایسی ہے کہ چین سے جغرافیائی اور تصوراتی دشمنی کے علی الرغم روس یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ امریکہ کوریا یا ویٹ نام کی طرف سے آگے بڑھ کے چین کو نیچا دکھا سکے۔ چین میں امریکہ کی کامیاب مداخلت تو دور کی بات ہے، روس کے تحفظ کا تقاضا یہ ہے کہ کوریا اور ویٹ نام تک میں امریکہ کا اثر و دخل نہ بڑھے۔ گویا دشمنی کے باوجود روس اپنی مصلحت کی بنا پر مجبور ہے کہ کوریا، ویٹ نام اور چین میں امریکہ کا دباؤ بڑھنے نہ دے۔ یہ پیشگوئی وثوق سے کی جا سکتی ہے کہ اول تو چین پر حملہ کرنے کی جرأت امریکہ کو کبھی نہیں ہو گی لیکن اگر بالفرض وہ پاگل پن پر اتر آئے تو روس اس اقدام کی مذمت کرے گا اور ضرورت پڑی تو ساری دشمنی بالائے طاق رکھتے ہوئے چین کی مدد کو پہنچے گا۔ وہ چین کا دشمن ہو سکتا ہے، وہ امریکہ سے بقائے باہم کی پینگیں بڑھا سکتا ہے لیکن چین جیسے علاقے میں امریکہ کو گوارا کر کے اپنے لئے خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اسی طرح روس ایشیا میں سے چین کو بے دخل کرنے کے لئے پوری کوشش کرے گا لیکن امریکہ اور چین میں انتخاب کی ضرورت ہوئی تو وہ امریکہ کو سرفہرست رکھیگا اور سب سے پہلے اسے بے دخل کرے گا۔

اگر چین جیسے معاملے میں روس امریکہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تو کوئی اور علاقہ یا مسئلہ ایسا نہیں ہو سکتا جہاں وہ امریکہ کو اپنا حریف نہ سمجھے۔ بقائے باہم کا تصور ان میں دوستانہ تعاون کا پیش خیمہ نہیں باہمی رقابت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔ بعض نقطوں پر آ کر روس اور امریکہ کے خطوط منحنی ہو کر ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں لیکن وہ متوازی رہے ہیں اور متوازی رہیں گے۔ امریکہ لاکھ سر پٹخے، وہ ان خطوط کو ایک نہیں کر سکتا۔ بقائے باہم عالمی سیاست کا سراب ہے۔ یہ کتنا ہی مکا کو تسلے، اب کے فریب میں نہیں آنا چاہیئے۔ یہ نتیجہ تخیل کی خلاقی نہیں بین الاقوامی سیاست کی ایسی زندہ حقیقت ہے جس کے مظاہر قدم قدم پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ دنیا کا نقشہ دیکھئے اور ایک طرف سے شروع کر دیجئے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ چین سے دشمنی اور امریکہ سے بقائے باہم کے باوجود روس چین میں امریکی اثر و نفوذ کو برداشت نہیں کرے گا۔ چین سے آگے سمندر میں وہ امریکہ کا راستہ روکے ہوئے ہے اور اسے طرح طرح سے پریشان کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے بحری بیڑے کو چند سالوں میں امریکہ کی سطح تک لے آیا ہے اور اسے سارے سمندر میں پھیلا کر امریکہ کے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔ جیسا کہ اگست کے "طلوعِ اسلام" میں بیان ہو چکا ہے، سمندر میں امریکہ اور روس ایک طرح کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس عجیب و غریب جنگ کی خبریں نہیں چھپتیں لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بقائے باہم کی ضد ہے۔ دوست یا دوست بننے کی دعویدار قومیں ایسی حرکات

کی مرتکب نہیں ہو سکتیں۔ سمندر کی جنگ سہ گونہ ہے۔ یہ سطح آب پر بھی لڑی جا رہی ہے، زیر آب بھی اور دور نیچے بھی تہ پر بھی۔ اسی سال مئی میں امریکہ کی ایٹمی آلات سے مسلح آبدوز ایسے ضائع ہو گئی کہ ابھی تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ اس کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیسے اور کہاں ضائع ہوئی۔ باخبر حلقے اسے روس اور امریکہ کی سمندری جنگ کی کرشمہ سازی قرار دینے پر آ گئے ہیں۔

ویٹ نام میں روس کے کردار کو کسی پہلو سے دیکھئے وہ امریکہ کے خلاف صف آرا دکھائی دے گا۔ ملیشیا کے علاقے میں روس برطانوی انخلا کے پیش نظر اپنی جگہ بنانے میں مصروف ہے۔ اس برصغیر میں وہ پاکستان اور بھارت دونوں سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ بھارت میں وہ بظاہر امریکہ کا حلیف ہے۔ اس مغالطے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ بھارت کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر امریکہ اور روس دونوں مجبور ہیں کہ بھارتی حکومت کو مدد کریں۔ اس بنا پر امریکہ اور روس کے دائرے ہم مرکز تو ہیں ایک نہیں۔ جونہی بایاں بازو قیادت کے قابل ہو گیا امریکہ اور روس ایک دوسرے کے ویسے ہی حریف ہو جائیں گے جیسے وہ چین میں تھے۔ بھارت میں ابھی وہ گھٹا برستی رہے گی جس کے بجلی کے کڑکے روس اور امریکہ کو لپیٹ جانے پر مجبور کریں گے۔ لیکن بالآخر مطلع چین کی طرح صاف ہو کر رہے گا۔ برصغیر سے ہٹ کے پاکستان اور پاکستان کے مسلمان ہمسایوں یعنی ایران اور ترکی میں جس حد تک روسی اثر بڑھ رہا ہے اسی حد تک امریکی اثر ختم ہو رہا ہے۔ عالم عرب میں تو روس خصوصیت سے امریکہ کے روبرو ہے۔ پچھلے سال کی اسرائیلی جارحیت نے عالم عرب میں امریکی اثر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور روسی اثر کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ اسی کے نتیجے میں بحر متوسط میں برسوں پہلے سے مقیم امریکی بیڑے کے مقابلے میں روس کا بیڑہ بھی آ موجود ہوا ہے۔ روس ان فوائد کو کسی طور ضائع نہیں کرنا چاہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امریکہ کے اثر و رسوخ کو عالم عرب میں پھیلنے سے روکے گا۔ گویا عالم عرب میں روسی مفاد کا تقاضا وہ نہیں جو امریکی مفاد کا ہے۔ لہٰذا یہاں بقائے باہم خارج از بحث ہے۔ امریکہ اور روس دونوں مل کے یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ عالم عرب میں امن و امان رہے۔ وہ یہ بھی چاہ سکتے ہیں کہ کشیدگی کی ایسی صورت پیدا نہ ہو جو انہیں ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑا کر دے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مفادات کا تقاضا متضاد رہے گا اور روس کی پوری کوشش ہوگی کہ امریکہ عربوں کی نظروں میں قابل تعظیم نہ بن جائے۔

عالم عرب سے آگے یورپ آتا ہے۔ وہاں امریکہ اور روس میں اب وہ کشیدگی دکھائی نہیں دیتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ جرمنی اور برلن جیسے نازک معاملات پر اب آئے دن وہ بحران نہیں اٹھتے جن سے امریکہ اور روس کی بھنویں تنی رہتی تھیں۔ لیکن یہ سمجھ لینا بہت بڑے مغالطے کا شکار ہونا ہے کہ یورپ میں دونوں بقائے باہم کے راستے پر گامزن ہو چکے ہیں۔ مغربی یورپ میں روس، امریکہ کے لئے کئی رخنے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ فرانس نے امریکہ کو آنکھیں دکھانی شروع کیں تو روس اس سے براہ راست دوستی پیدا کرنے لگ گیا۔ روس جرمنی کو بھی امریکہ کے تسلط سے نکالنے میں لگا ہوا ہے۔ گو اس کی اپنی اشتراکی برادری میں انتشار کے آثار نمودار ہو چکے ہیں تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ یورپ سے امریکہ کو نکالنے میں لگا ہوا ہے۔ یورپ کا آئندہ نقشہ کچھ بھی ہو اس میں امریکہ کا اثر رہا بھی تو کم سے کم ہوگا اور اسے ختم یا کم کرنے میں روس کا نمایاں ہاتھ ہوگا۔ امریکہ کے قرب و جوار میں کیوبا کی مثال اس کا مزید ثبوت ہے کہ ان کی زبانیں بقائے باہم کا ورد کرتے کرتے نہ بھی تھکیں تو امریکہ اور روس کے دل اس کی تصدیق کسی طور نہیں کریں گے۔ کیوبا میں امریکہ یہاں تک ہوش و حواس کھو بیٹھا کہ طاقت کے زور پر اسے اشتراکیت سے توبہ کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ روس اپنے میزائل لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس پر امریکہ نے

آپے سے باہر ہو کر ایٹمی جواب دینے کی دھمکی دی ہوشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روس اپنے میزائل واپس لے آیا۔ یوں ایٹمی تصادم کا خطرہ بھی ٹل گیا اور کیوبا میں امریکی فوجی مداخلت کا بھی۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ہرچند اس کے بعد دونوں نے یہ انتظام کر لیا کہ دونوں ملکوں کے سربراہوں کے درمیان براہ راست ٹیلیفون کا رابطہ پیدا کر لیا تاکہ آئندہ کشیدگی بے قابو ہوتی دکھائی دے تو وہ آپس میں گفتگو کر کے اپنی ذمہ داری سے مناسب اقدامات کریں۔ لیکن یہ انتظام ایٹمی جنگ کے خوف کا نتیجہ ہے ایٹمی قوتوں کی دوستی کا ہرگز نہیں۔ امریکہ اور روس میں بقائے باہم ہے تو صرف اس حد تک کہ نوبت ایٹمی جنگ تک نہ پہنچ جائے۔ اس سے ادھر ادھر وہ ایک دوسرے کے حریف ہیں حلیف نہیں۔ اگر صدر جانسن کی یہ تجویز کہ دونوں ممالک پوری دنیا کو آپس میں تقسیم کر لیں، ممکن العمل بھی ہو جائے تو بھی روس اور امریکہ میں خیر سگالی یا بقائے باہم کی حقیقی فضا پیدا نہیں ہوگی۔ یہ وا ماندگی شوق کی تراشی ہوئی پناہ ہوگی ـــ عارضی اور برسبیلِ آہو۔ یہ وہ وقفہ ہوگا جس سے دونوں "آگے بڑھیں گے دم لے کر"۔ یہ وقفہ نہ عالمی امن ہوگا نہ امن کا پیش خیمہ۔ عالمی امن کا تصور اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک آزاد قومی مملکتیں قائم ہیں۔ انسانیت کو قومیتوں میں تقسیم کیا یا رکھا جائے گا تو نتیجہ فساد اور بدامنی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ روس اور امریکہ دونوں کا کردار اسی فساد اور بدامنی کا آئینہ دار ہے۔ اس کا خاتمہ بالائے قومی تصورات کی عالمگیر حکمرانی کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسے تصورات دو ہیں۔ ایک اشتراکیت دوسرا اسلام۔ لیکن جہاں اشتراکیت کا زمانہ لحظہ لحظہ دگرگوں ہے وہاں اسلام کے نام لیواؤں کا زمانہ بدلتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی تفصیل اپنے وقت پہ آئے گی۔ مسکین دل انسان کی کشمکش ہر حال یہی ہے کہ اس کی نجات کا آوازۂ حق کب آئے گا اور کدھر سے!

مسلمانوں کی تاریخ

کے متعلق تو آپ نے بہت سی کتابیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن خود اسلام کی تاریخ کیا ہے؟ یہ شروع میں کیا تھا؟ پھر راستے میں اس پر کیا گزری، اس میں کس کس قسم کی آمیزش ہوتی اور بالآخر وہ کیا سے کیا بن گیا؟

اس قسم کی کتاب شاید آپ کی نظروں سے نہ گزری ہو ـــ مصر کے نامور مؤرخ

علامہ احمد امین

نے اس موضوع کو اپنی تحقیق کا مرکز قرار دیا۔ اور ایک سلسلہ کتب شائع کیا ـــ اس سلسلہ کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام نے اس کا نہایت شگفتہ اردو ترجمہ دو حصوں میں شائع کیا ہے ـــ قیمت ہر حصہ چار روپے

ناظم۔ ادارۂ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ لاہور

قرآنی دعوتِ فکر کے چند اہم شاہکار

۱۔ لغات القرآن یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۱۲ روپے۔ مکمل سیٹ۔ پچاس روپے ہیں۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟ یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت (قسم اعلیٰ)۔ آٹھ روپے۔ (جیب ایڈیشن) چار روپے

۳۔ سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے مُلّا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اس کے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول۔ آٹھ روپے۔ حصہ دوم و سوم چھ چھ روپے

۴۔ نظام ربوبیت نظام سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

۵۔ خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت (قسم اعلیٰ) مجلد۔ نو روپے، قسم دوم۔ پانچ روپے۔

۶۔ بہارِ نو پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ۔ اس میں بڑے اہم مضامین آگئے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ کے تقاضے، تعلیم جدید کے اسلام کے خلاف پیدا ہونے والے اعتراضات۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی الجھنیں۔ ان سب سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم اور پرویز صاحب کا قلم۔ اس سے آپ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ کر لیں۔ جیبی ایڈیشن۔ قیمت ۳ روپے

۷۔ مقام حدیث وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت ۱۴/- روپے۔

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی دیگر تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

معراجِ انسانیت

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن - خود قرآن کے آئینے میں

حُسنِ سیرت کی رعنائیاں - خالقِ حُسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں ۔
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے ۔
- غیر مُسلموں کے اعتراضات کا مدلّل اور مسکت جواب ۔
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین بارگاہِ رسالت مآب میں ۔

ب انقلاب انگیز تصنیف ۔ ایک عہد آفریں کوشش ۔ عشق و خرد کا حسین امتزاج ۔

سائز ۔ ضخامت قریب پانچسو صفحات ۔ کاغذ نہایت اعلیٰ ۔ جلد مضبوط ۔ گرد پوش جاذبِ نگاہ

قیمت ۔ بیس روپے Rs. 20/-

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

مکتبہ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور

لاہور سے

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات اور دیگر نامور مصنفین کی تصنیفات

حاصل کرنے یا منگانے کا پتہ:

مکتبہ دین و دانش

چوک اردو بازار لاہور